

ہم بھی کیسے پاگل تھے

مدیجہ تبسم

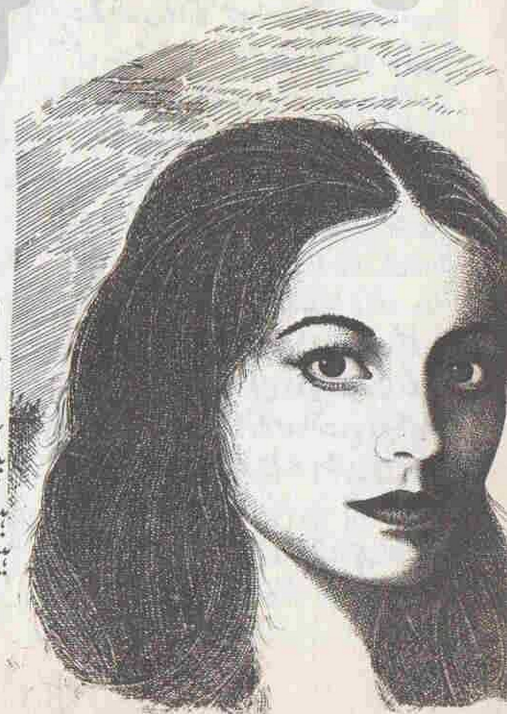
”سامعین اب ہم آپ کا تعارف کروا رہے ہیں“ نعمت کدہ“ کے افراد سے، حالانکہ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اس کا نام نعمت کدہ کی بجائے حیرت کدہ ہوتا تو زیادہ بہتر رہتا کیونکہ یہاں آنے کے بعد ہر انسان کم از کم ایک دفعہ تو ضرور حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن ہمارے تایا ابا بڑے شکر گزار انسان ہیں اور اللہ کے شکر آنے کے طور پر انہوں نے اس گھر کا نام نعمت کدہ رکھا ہے شکر ہے کہیں ”شکر یہ کدہ“ نہیں رکھ دیا۔“

تو اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف۔

ناولٹ

ہیں اور خود کو تصور میں ابن صفی خیال کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ لاؤنج کے آخری کنارے یہ بیٹھی اپنے بالوں میں نجانے کون کون سی ابلاتھوئے والی ”صبا“ ہے۔ جو ساری عمر اپنے بالوں کو لمبا کرنے کی کوشش میں لگی رہے کی اور یقیناً نا کام ہی رہے گی۔ اس کے باوجود وہ خود کو ”باد صبا“ کہتی ہیں لیکن ہیں وہ بادِ سموم! یہ بھی بڑے تایا ابا کی بیٹی ہیں اور ان ہی کی طرح جلائی ہے۔

اور ڈائجسٹ میں پوری طرف ڈوبی اپنے آپ سے یکسر لاپرواہ کاؤنج یہ ہی دھرتا مارے بیٹھی ”رومی“ ہے۔ بظاہر یہ بالکل پرسکون نظر آتی ہیں۔ بیکہ روم کی طرح لیکن اندر سے پوری ہٹلر ہیں شاہ روم کی طرح۔



”ہاں جھوٹ بولنے میں تو تم نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔“ رومی جو ڈائجسٹ پوری طرح چاٹ چکا تھا اسے ایک طرف رکھ کر طنز یہ لکھ میں بولی۔

”تو تم خود کون سا کسی سے کم ہو، جھوٹوں کی نانی۔“ زین کیوں کسی سے پیچھے رہتا۔

”اے کتو تو توں کا پتہ ہے ناں؟“ رومی نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

”لہذا اپنی زبان بند رکھو ورنہ سارا کچا چھٹا کھول دوں گی۔“ اس کی دھمکی کافی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ زین برا سامنے بنا کر جب ہو گیا۔

پوربج میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو ان سب میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ تایا بابا کا مخصوص بارن وہ سب پہچانتے تھے۔

سب سے پہلے صبا اُٹھی تھی اور اپنے مہندی لٹھڑے بالوں سمیت واش روم میں گھر گئی۔

رومی ڈائجسٹ صوفے کے نیچے کھاکر بچن میں بھاگ گئی۔ یعنی نے اپنی کتاب بجل میں دہائی اور اوپر کی طرف بھاگی۔ زین سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف لپکا لیکن جاتے وقت وہ ڈریو پھری مورکا بوسٹر اتارنا نہیں بھولا تھا۔ شہزاد کو اور کوئی جگہ نہ ملی تو اپنے گٹار سمیت گیٹ روم میں گھر گیا۔ واحد علی ہے لاؤنج میں باقی بچا تھا اور اس خاندان کا وہ واحد لڑکا تھا جو ڈٹ کر پڑھنے کے بعد اب بزنس میں دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ لہذا اسے ڈانٹ پڑنے کے چانسز کم ہی تھے۔

”ہائے میرے اللہ! تیرا خانہ خراب ہو صوفی کے نیچے۔“ اپنے سفید لمبل کے دوپٹے کا خشر دیکھ کر جیو جیگ نے ہلکی غصے سے چیخ کر گھوڑا۔

”اف بڑی امی! میرے بچے کہاں سے آ گئے ہیں تو ابھی خود بچے ہوں۔“ نفی نے بے اختیار اپنا ماتھا پیت ڈالا۔

”بچے کے دادے! پہلے یہ بتا کہ تو میرا دوپٹہ کیوں لے کر گیا تھے تو رومی نے دوسرا دوپٹہ دیا تھا۔“ واقعی صبح رومی نے اسے اپنا دوپٹہ ڈانی کرنے کے لئے دیا تھا۔ اب شوخی قسمت کہ جس ٹیبل پر وہ دوپٹہ رکھ کے گئی اس ٹیبل پر بڑی امی کا دوپٹہ بھی پڑا تھا۔ جو پچھلے دنوں تہینہ خالہ سعودیہ سے لائی تھیں اور انہیں بہت پسند تھا۔

”بڑی امی! ابھی تو میں باپ بننے کی حسرت دل میں دباؤں گھوم رہا ہوں اور آپ نے مجھے دادا بنا دیا۔ چلیں اللہ آپ کی دعائیں پوری کرے۔“ صوفی نے نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔

”کس کی دعائیں پوری ہو رہی ہیں۔“ علی نے اسی وقت اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں ہوئیں مستقبل قریب میں شاید ہو جائیں۔“ بڑی امی کی متوقع ڈانٹ سے بچنے کی خاطر صوفی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔

”اسے تو عادت ہے اسی سیدھی باتنے کی تم بتاؤ بکرا لینے گئے تھے ملا نہیں کیا؟“ صوفی کی پشت کو خشکیاں نظر آ رہی تھیں گھورتے ہوئے وہ علی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”کیا بتاؤں امی جان! ایک تو عید میں اتنے کم دن رہ گئے ہیں سورش بھی بہت زیادہ تھا۔ پھر ابو جی کو بھی کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔ چنانچہ ابو جی ادھر چلے گئے اور میں گھر آ گیا۔ اب شام کو زین اور صوفی کو ساتھ لے جاؤں گا پھر لے آؤں گا کوئی بکرا یا گاے۔ جو بھی پسند آجائے۔“

پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے اس نے تفصیل بتائی۔

”علی! آج پھر بکرا نہیں لے کر آئے تم۔ کتنے دنوں سے ٹر خا رہے ہو۔“ دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھول کر عینی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”انتا بڑا ہے تم سے۔ شرم نہیں آتی منہ بھاڑ کر علی کہتے ہوئے۔ بھائی کہتے ہوئے منہ دکھتا ہے تمہارا۔“ بڑی امی کے لٹاؤ نے پروہ پھلا گئی۔

”مم..... میرا مطلب یہی تھا کہ علی یعنی علی بھائی۔“ پھلا ہٹ میں وہ بے ترتیب سے لفظ بول گئی۔ علی بے اختیار مسکرا دیا۔

”عینی! کھانا تو لا دو بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ جانتا تھا امی جان اتنی جلدی اسے نہیں چھوڑنے والی لہذا خود ہی اسے وہاں سے ہٹا دیا۔

”زین بھائی! دوپہر میں کھانا کھانے کے بعد پھر بھوک لگ گئی ہے؟“ وہ بچن میں داخل ہوئی تو زین کو ٹرائفل سے انصاف کرتے دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

”یہ زین بھائی کس کو کہا ہے؟“ حلق سے نیچے اترتا ٹرائفل کو نین سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا اسے نے تملکا کر عینی کو دیکھا۔

”اب تمہاری وجہ سے ڈانٹ کھاؤں پہلے ہی علی بھائی کی وجہ.....“

”یہ کہیں آج بھائی چارے کا دورہ پڑا ہوا ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر غصے سے بولا۔

”بڑی امی نے کہا ہے جو تم سے بڑا ہوا ہے بھائی کہا کرو۔“ اس نے بردباری سے بتایا۔

”اچھا مجھے ایک بات بتاؤ۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر تمہارا شوہر تم سے بڑا ہوا تو تم اسے بھی بھائی کہو گی؟“

”ہاں تو پھر.....“ وہ بے دھیانی سے سر ہلانے لگی پھر سمجھ آنے پر ایک دم چلا اُٹھی۔

”نہیں زین! اسے تو بھائی نہیں کہوں گی۔“

وہ سب عید کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ چچی جان جو کہ مقامی کانج میں پکچر تھیں کپڑوں کی ڈیزائننگ نہایت غصب کی کرنی تھیں جب کہ چھوٹی تانی امی نہایت مہارت سے سلائی کرتی تھیں۔ اب بھی وہ دونوں پوری طرح مہنگ تھیں۔ رومی ان کے پاس بیٹھی اپنے مشوروں سے نواز رہی تھی۔ کیونکہ اسی کا عید کا ڈریس انڈر پروڈکشن تھا۔

”رومی! میرا وائیٹ سوٹ پر لیں کر دو۔ ہم نے ابھی بکرا منڈی جانا ہے۔“ علی نے صوفی سے پوچھتے ہوئے حکم صادر کیا۔ وہ جھنجھلا گئی۔ اگر امی جان نہ ہوتیں تو یقیناً کوئی کرارا سا جواب ضرور دیتی۔ لہذا اسے خشکیاں نظروں سے گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔ وہ چند لمحے ادھر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر اس کے پاس چل دیا کہ اس کے بغیر ادھر بیٹھ کر کیا کرتا؟

”بکرا منڈی تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے امریکہ جانا ہو۔ نواب زادہ! سلوٹ زدہ کپڑوں میں تو جیسے اسی کسی نے بکرا ہی نہیں دینا۔ ہونہ۔ بکرا لینے جانا ہے یا رشتہ مانگنے۔“ وہ مسلسل بڑبڑاتے ہوئے اس کا سوٹ پر لیں کر رہی تھی۔

”یہ تم میرا کام کرتے وقت اتنی باتیں کیوں کرتی ہو؟“ اس کی جھنجھلاہٹ کو انجوائے کرتے ہوئے وہ خاصی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”اور تم نے اپنا ہر کام مجھ سے ہی کیوں کروانا ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں یا میرے علاوہ کسی اور کا نام لیتے ہوئے زبان میں لکنت آ جاتی ہے۔“ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

”وہ کیا کہتے ہیں کہ جو بات تم میں ہے وہ کسی اور میں کہا۔“ اس کا انداز سراسر چیخڑانے والا تھا اور وہ تو پہلے ہی چڑی بیٹھی تھی۔

”اب اگر تم نے کوئی بکواس کی تو میں یہ آئرن اسٹینڈ سمیت ہر چیز تم پر الٹ دوں گی۔“

76

وہ جارحانہ لہجے میں بولی تو علی بے ساختہ مسکرا دیا۔

کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں فارغ نہیں ہوں صبا یہ کہو۔“ وہ اپنے دوپٹے میں ستارے ٹانگ رہی تھی جو اسے صبح پہناتا تھا لہذا اس نے کورا جواب دے دیا۔

”صبا! مجھے مہندی لگا دو۔“ وہ مہندی کی کون اٹھائے اب صبا کے پاس آگئی۔

”یعنی! کپڑے پر لیس کرنے لگی ہوں۔ اتنا ڈھیر ہے کپڑوں کا تمہیں مہندی لگانے بیٹھ گئی تو وہ کون پر لیس کرے گا۔“ اس کے جواب پر یعنی کا منہ لٹک گیا۔

”میں گائے کو مہندی لگا آیا ہوں بلکہ رنگ برنگی پٹیاں بھی باندھ کر آیا ہوں۔“ شہزاد نے اندر داخل ہوتے ہوئے ایسے فاتحانہ انداز میں کہا جیسے مسئلہ شہر حل کر آیا ہو۔

”مبارک ہو، یہ نی وی آپ کو بطور ایوارڈ پیش کیا جاتا ہے۔“ علی نے نی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شہزاد مشکور سی مسکراہٹ سمیت پاس بڑے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہے تمہارے پاس۔ علی کوکل میں نے اتنی دفعہ کہا تھا ہمارے لئے چوڑیاں لے آئے جمال ہے جو اس کے کان پہ جوں تک رہ سکی ہو۔“ رومی نے علی کو گھورتے ہوئے کہا تو مسکراہٹ خود بخود ہی اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”تم کہو تو چوڑیوں کا پورا اسٹال ڈھیر کروا دوں تمہارے آگے۔“

”ہاں بس ڈائیا لگ بولے آتے ہیں تمہیں۔“ وہ کام سے فارغ ہو چکی تھی لہذا دوپٹہ ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

”بھئی مجھ سے جس نے ناراض ہونا ہے شوق سے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ صفی نے صوفے پر ہی دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح عیدی دینے سے بچ جاؤ گے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ استری

کا گلگ لگاتے ہوئے صبا نے کہا۔

”یعنی! تمہارے چاچو چائے مانگ رہے ہیں۔“ چچی جان نے یکن میں سے آواز لگائی۔ وہ خواتین صبح کے لئے لوازمات تیار کر رہی تھیں۔

”اس لئے کہہ رہی تھی کہ مجھے مہندی لگا دو۔“ یعنی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی۔

”ایک کپ میرے لئے بھی۔“ ان سب نے ایک ساتھ کہا یعنی تملارا کمری اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر سب کو ہنسی آگئی چند سیکنڈ انہیں گھورنے کے بعد وہ خود بھی ہنسنے لگی۔

سارے مردوں کے عید گاہ جانے کے بعد ان سب نے مل کر سارا پھیلاوا سمیٹا اور جلدی سے تیار بھی ہو گئیں۔ ان کے واپس آتے ہی وہ مہندی لینے کے لئے ان کے سر ہو گئیں۔ بڑے تالیاں چھوٹے تالیاں اور چچا جان تھے عیدی لینے کے لئے دروازوں سے عیدی مانگنے لگیں جو غربت کا رونا کر اپنی جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔

”آج کے دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔“ بڑے طریقے سے ہماری عیدی نکالو۔“ رومی نے دھونس بھرے لہجے میں علی سے کہا۔ آف انٹ سوٹ جس پر خوبصورتی کے ساتھ ملی شیڈ کا کام کیا گیا تھا زیب تن کیئے بالوں کی ڈیسی سی ڈی بنائے، اینٹ سے میک اپ میں وہ اتنی لگی لگ رہی تھی کہ علی بے اختیار ہی اسے دیکھے

”آج کے دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔“ بڑے طریقے سے ہماری عیدی نکالو۔“ رومی نے دھونس بھرے لہجے میں علی سے کہا۔ آف انٹ سوٹ جس پر خوبصورتی کے ساتھ ملی شیڈ کا کام کیا گیا تھا زیب تن کیئے بالوں کی ڈیسی سی ڈی بنائے، اینٹ سے میک اپ میں وہ اتنی لگی لگ رہی تھی کہ علی بے اختیار ہی اسے دیکھے

”گھورے کیا جا رہے ہو عید نکالو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”بھئی شرمنا بھی لیا کرو۔“ اس نے گویا کی۔

”مجھ پر کون سی آفت آن پڑی ہے کہ تم شرمنا پھرو۔“ اس نے بے نیازی سے

”بھئی سیدھی سی بات ہے میں تو نہایت کنگال ہوں لہذا مجھ سے قطعی امید نہ رکھی جائے۔“ صفی نے صاف دامن بچانا چاہا۔

”میں بھی۔“ شہزاد بھی اس کا ہم نوا بن گیا۔

”عیدی تو ہم نے لینی ہے چاہے اپنا گٹار بیچ کے دو۔“ وہ کہاں معاف کرنے والی تھیں۔

انہوں نے جان چھڑانا چاہی لیکن وہ بھی بڑی کانیاں تھیں۔ عیدی لے کر ہی چھوڑی۔

”زین اچھا رہ گیا جو پہلے ہی چلا گیا۔“ صفی نے خٹندی سانس بھری۔ زین دو دن پہلے ہی اپنے گھر گیا تھا۔

”صبا! یہ گاجر کا حلوہ تو ذرا سندس کو دے آؤ۔“ چچی جان نے اسے ڈش بکراتے ہوئے

کہا۔ سندس ان کے برابر میں اپنے دو بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی تھی صبا کی اس سے کافی دوستی تھی۔ چچی جان سے ڈش پکڑ کے وہ سندس آپنی کے گھر آگئی۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ کیونکہ پچھلے تقریباً دو سال سے اس کا سندس آپنی کے گھر کافی آنا جانا تھا لیکن ان کے گھر اس نے بھی ایسے رنگ لڑکے کو آتے نہیں دیکھا تھا۔

اسے دیکھ کر غائبانہ بھی حیران ہوا تھا۔

”آئیے، آئیے آخر کسی کو تو ہمارا خیال آیا

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہاں کے بڑوسی کتنے بے مروت ہیں۔“ صبح سے کسی نے یہاں جھانکا بھی نہیں۔“ وہ نہایت خوشدلی سے بولا۔

”کون ہیں آپ؟“ صبا نے نہایت مشکوک نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ براؤن کھدر کا

سوٹ پہنے، پاؤں میں گھریلو سادہ سے سیلر، سلیقے سے چھائے کئے بال اور شکل صورت بھی ٹھیک ٹھاک تھی، شکل سے تو پورا اچکا نہیں لگتا۔ اس نے

”رومی! مجھے مہندی لگا دو۔“ یعنی نے رومی

لجے میں کیا۔

”تم ہو، میری خوشیوں کے قاتل! تم سے میری خوشی دیکھی ہی نہیں جاتی علی!“ غصے سے چلائی وہ دھاڑ سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ علی نے بے اختیار اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھوسیں۔ پھر اطمینان سے مسکرا دیا۔
”مجھے سے زیادہ تمہاری خوشیوں کا امین کون ہو گا رومی دُشیر!“

اور پھر ہوا وہی تھا جو اس نے کہہ دیا نجانے اس نے کون سی رات کی تھی کہ بڑی امی تو ایک طرف اس کی اپنی امی کے جانے پہ راضی نہیں تھی۔ صبا اور عینی البتہ اس تھیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ خوب جی بھر کے روئی تھی اور علی سے تو اس نے بالکل ہی بات نہیں کی تھی۔

”تین افراد گھر سے کیا گئے ہیں گھر تو بالکل خالی خالی لگنے لگا ہے۔“ وہ لان میں پودوں کو پانی لگا رہی تھی۔ صفی اور زین اس کے پیچھے کین کی کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ شہزاد اکیڈمی گیا ہوا تھا۔ جب کہ علی ابھی آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ بڑوس میں فوننگی ہو گئی تھی بڑی امی ادھر گئی ہوئی تھیں جب کہ امی جان سبزی بنا رہی تھیں۔

”تو اور کیا اور بیٹیاں تو ویسے بھی پرایا دھن ہوتی ہیں۔“ امی جان نے ٹھنڈی ساس بھرتے ہوئے کہا۔

”ایسا کیوں ہوتا ہے امی جان! اتنے لاڈ سے ہم اپنی بہنوں، بیٹیوں کی پرورش کرتے ہیں اور کتنے آرام سے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔“ صفی کے لہجے میں کمی گھل گئی۔ رومی کا اپنا دل بھر آیا۔ اس نے کب سوچا تھا وہ اپنا اپنا پیارا گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔

”رومی! ادھر آؤ میرے پاس۔“ صفی نے اسے رکارا تو وہ خاموشی سے چلتی اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر ایک دم ہی اسے پتہ نہیں کیا ہوا تھا اس کے گلے لگ کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”رومی! چندا کیا ہوا؟“ وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی صفی!“ وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ صفی کی آنکھیں بھر آئیں۔ امی جان بھی آبدیدہ ہو گئیں۔

”خیر بہت تو ہے کیا ہوا؟“ علی ابھی آیا تھا ان سب کی شکلیں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ رومی ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور اندر چلی گئی۔ اس کی حرکت پر متعجب ہوتا وہ پوچھنے لگا۔ امی جان اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے بتانے لگیں۔

”تو کون کہہ رہا ہے اسے یہاں سے جانے کے لئے۔“ خواجواہ آپ سب ممکن ہو رہے ہیں۔“ اس نے جیسے ان سب پہ افسوس کیا۔

”لگتا۔“ امی جان مسکرا دیں۔
”بھئی بیٹیوں کو بھی کسی نے گھر بٹھایا ہے آج یا کل انہیں رخصت تو کرنا ہی ہے۔“ ان کا لہجہ پھر بھنگنے لگا۔

”تم دونوں سے ایک لڑکی نہیں چپ کروائی گئی، تف ہے تم پر۔“ صفی اور زین کو افسوس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”جس رفتار سے پچھلے تین دنوں سے رہ رہی ہوا اگر اسی طرح روتی رہی تو بالکل ہی ختم ہو جاؤ گی پھر کوئی بیاہنے بھی نہیں آئے گا۔“ وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔

”فکر نہ کرو تمہاری منتیں نہیں کروں گی۔“ وہ تڑخ کر بولی سارا رونا دھونا تو ٹور پڑا نہ جانے کی وجہ سے تھا اور یہ سارا کیا دھرا ابھی علی کا تھا۔
”تمہاری منتوں کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ رومی نے جواب دینا گوارا نہ کیا۔ سامنے بڑا میکیزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ غصہ کس بات ہے؟“ اس نے نہایت دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

جواب اس نے کہا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”دیکھو رومی! ہمیشہ اپنے مفاد کے لئے نہیں سوچنا چاہیے۔ بلکہ ہماری سوچ سب کے لئے یکساں ہونی چاہیے۔ مجھے معلوم ہے تمہیں غصہ کس بات کا ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچو تمہیں روکنے کا کوئی نہ کوئی محرک تو ہو گا۔“ اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔

”تم خود سوچو تم سب کے چلے جانے سے یہاں کتنی ڈسٹرینس ہونی تھی۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا گھر ہے اور اتنے زیادہ افراد۔ اب امی جان اور چھوٹی امی میں اتنا استیسا نہیں ہے کہ وہ اتنا کام کر سکیں۔ صرف اپنی انجوائے منٹ کی خاطر انہیں تکلیف میں ڈالنا تمہیں گوارا ہے؟“ اس نے رک کر پوچھا تو رومی کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔

”اب دیکھو جو تم نے آٹھ دن کے ٹور کی قربانی دی ہے تو اس کے بدلے میں سب کے دلوں میں تمہاری قدر کتنی بڑھ گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم چلی بھی جاتی تب بھی تمہارا دل یہیں اٹکا رہنا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے بھی تمہیں سب کی فکر دینی تھی۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم یہیں رہ کر سب کی فکر کر لو۔“ اس کی باتوں سے وہ واقعی قائل ہو گئی تھی۔ اس پہلو پر اس نے واقعی نہیں سوچا تھا۔

”لیکن علی! یہ بات تم صبا اور عینی سے بھی کہہ سکتے تھے لیکن تم ہر بات میں مجھے ہی گھسیٹتے ہو۔“ وہ منہ بنا کر بولی تو علی ہنسنے لگا۔

”چلو اب تم ایک دفعہ ہی چلی جانا۔ میں تمہارے شوہر سے کہوں گا ہماری رومی کو مری دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ لہذا اس کی یہ خواہش ضرور پوری کرنا۔“ اس کی بات پر وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”اب ایسی بھی بات نہیں۔“

”پھر کیسی بات ہے؟“ وہ دہرہ بولا۔
”اگر یہ ساری تقریر تم پہلے ہی کر لیتے تو کم از کم مجھے اتنا رونا تو نہ پڑتا۔“ اس نے خفگی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم کافی عقلمند ہو لیکن اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تمہارا اپرچیمر بالکل خالی ہے۔“ اس کا انداز شرارتی تھا۔

”ہاں تمہارا اپرچیمر تو جیسے قل سے ناں۔“ وہ کون سا کسی سے کم تھی۔ ویسے بھی علی کی باتوں سے وہ کافی ہلکی ہلکی ہو گئی تھی۔
”بالکل۔“ وہ مسکرایا۔

”اور ڈنر کے بعد تیار رہنا آئس کریم کھانے چلیں گے۔“ اس کی بات پر وہ خوش ہو گئی۔

”علی! تم کتنے اچھے ہو۔“

”اور اس دن کیا کہہ رہی تھی، تم تو میری خوشیوں کے قاتل ہو۔“ اس نے ہو بہو اس کی نقل اتاری۔

”اچھا! اب شرمندہ تو مت کرو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس کھڑا ہوتا دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھا۔

”رات کا کھانا میرے فرشتوں نے نہیں بنانا، مجھے ہی بنانا ہے۔“ مڑے بغیر کہتی وہ باہر نکل گئی اور کھانا بناتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

”علی! واقعی اچھا ہے میں خواجہ اسے برا بھلا کہتی رہی۔“

چچی جان وغیرہ کا ٹرپ واپس آچکا تھا۔ چند دن تو وہ خوب زور و شور سے اسے اپنی روداد سنا رہی پھر وہی گئی بندھی روٹین۔

”یار! ہم لوگ کتنے بور ہیں۔“ صبا نے ایک لمبی سی جمائی لیتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں اس وقت سنگ روم میں آدھی ترچھی لیٹی تھیں۔

”کیوں، یہ تمہیں یکا یک بوریٹ کیوں ستانے لگی۔“ رومی نے تھوڑا متعجب ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”دیکھو ناں! اتنا بڑا گھر ہے ہمارا اور اتنی ساری جوان جہان اولاد۔ لیکن ہماری ماؤں کو ذرا بھی پرواہ نہیں، چلو شادی نہ ہی کم از کم ایک آدھ کی تو پہنچنی کر دیں۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے سب کی فکر اس اپنی کو ہو۔

”لو بھلا منگنی کروانے کا کیا فائدہ؟“ عینی نے برا سامنہ بنایا۔

”فائدہ تو بڑے ہیں لیکن فی الحال میرا دل کر رہا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی منشن ہو۔ تھوڑا ہلا گا ہو۔ ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں اگر رومی مان جائے تو؟“ صبا نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہاری اور عینی کی منگنی کر دیتے ہیں اور بقرہ عید پر رخصتی۔“ کو کیسا زبردست آئیڈیا ہے۔“ اس نے داد طلب نظروں سے رومی کو دیکھا۔

”صبا کی بچی!“ اس نے پاس پڑا کٹنن اسے دے مارا جسے نہایت سہولت سے صبا نے پیچ کر لیا۔ عینی زور زور سے ہنسنے لگی۔

”بھلا کیا کی ہے میرے بھائی میں؟ اور تمہیں تو ویسے بھی خوب پریکٹس ہوئی ہے وہ اپنے ہر کام کے لئے تمہیں ہی آوازیں دیتا ہے بعد میں اور آسانی ہو جائے گی۔“ وہ اپنی رومیوں بولے جا رہی تھی۔

”براہر والوں کے بڑے بیٹے سے جو سنار ہے۔ خوب سونا پہنا نہیں گے تمہیں۔“ جواباً اس نے بدلہ اتارا تھا۔

”اے دفعہ کرو اس کالے کو، یہ اپنی سندس آبی ہیں ناں اس کے بھائی سے بھی ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی قسم سے بندہ بڑا بینڈم ہے۔“ صبا نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا رومی

اس کے انداز پہ سلگ گئی۔

”ملاقات؟“ عینی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”انسانی ملاقات کہیں کوئی اور مطلب نہ لے لینا۔“ اس نے صحیح کی۔ پھر اس سے پہلے کہ رومی مزید کوئی سوال کرنی ٹیلیفون کی تیز بیل نے ان تینوں کو ڈسٹر ب کیا تھا۔ وہ تینوں ٹیلیفون سیٹ کو گھور کر رہ گئیں۔ لیکن ازلی کاہلی کی بناء پر کسی نے اٹھ کر اسے سننا گوارا نہیں کیا۔

”گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟“ تایا ابا شاید ابھی آئے تھے پھر اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی فون ریو کر نی تایا ابا لاؤنج میں پڑے سیٹ کار ریو اٹھا چکے تھے۔

دوسری طرف خدیجہ تھیں ان کی اکلوتی پیچھو، جو امریکہ میں رہتی تھیں۔ پل بھر میں سارا گھر اکٹھا ہو گیا تھا۔ کیونکہ پیچھو جب تک خود ہر ایک سے بات نہ کر لیتی ان کو چین پڑتا تھا۔ سب سے بات کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ تایا ابا سے بات کی تھی۔

”بھائی جان! میں ہمایوں کو پاکستان بھیج رہی ہوں۔“

”ارے ہمایوں کا اپنا گھر ہے یہاں وہ جب مرضی آئے۔“ تایا ابا کی بات پر ان سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

”وہ تو ٹھیک سے بھائی جان! لیکن آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟“ خدیجہ پیچھو نے تصدیق چاہی تھی۔

”مجھے بالکل یاد ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ آ جاؤ اور اپنی امانت لے جاؤ۔“ تایا ابا نہایت خوشدلی سے بولے تو ان سب کے دل دھڑک اٹھے نجانے وہ کون سی ”امانت“ کی بات کر رہے تھے۔

”مجھے تو آنے یہ کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو آج کل کی نئی ٹیکل کا تو پتہ ہے ناں بس

ہمایوں کی ضد ہے کہ پہلے وہ آئے گا۔“

”تو آنے دواسے آخر کو پاکستان اس کا ملک ہے اس کا بھی دل چاہ رہا ہوگا یہاں آنے کو، سب کو ملے ملانے کو۔“ تایا ابا کے لہجے میں محبت رچی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر جیسے ہی اس کی سیٹ کنفرم ہوگی میں آپ کو اطلاع دے دوں گی اللہ حافظ!“ فون بند کر کے تایا ابا انہیں ہمایوں کی آمد کے متعلق بتانے لگے۔

ہمایوں ان کی اکلوتی پیچھو کا اکلوتا بیٹا تھا اور پہلی دفعہ پاکستان آ رہا تھا۔ لہذا وہ سب ہی بہت خوش تھے اور اس کے منتظر بھی۔

”آج اگر میں خدا سے کچھ اور مانگ لیتا تو یقیناً وہ بھی مل جاتا۔“ لان عبور کر کے وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی سب سے پہلے اس کا سامنا تیمور سے ہوا تھا جو اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

”تو مانگ لیا ہوتا اب کیوں افسوس کر رہے ہیں۔“ اس نے ابرو چڑھا کر کہا۔

”افسوس تھوڑی کر رہا ہوں۔“ اس نے طنز کیا۔

”میرے پاس تو بڑی بڑی قابل رشک چیزیں ہیں کبھی فرصت سے آئے گا آپ کو دکھاؤں گا تو دنگ رہ جائیں گی۔“ وہ محفوظ سی مسکراہٹ سمیت بولا۔

”میرے پاس فائنو نام نہیں ہے اوگی ہوگی چیزیں دیکھنے کے لئے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔ اسی وقت سندس آبی آئیں۔

”چلیں آبی!“ انہیں دیکھتے ہی صبا نے پوچھا۔ سندس آبی جب بھی شاپنگ کرتی تھیں۔ زیادہ تر صبا کے ہی ساتھ کرتی تھیں۔ آج بھی انہوں نے صبا کو پیغام بھیجا تھا۔ اسے بھی دو چار ضروری چیزیں لینا تھیں لہذا وہ آگئی۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ تیمور بھی آج یہاں پہنچا ہوگا۔

”ہاں چلو۔“ انہوں نے چار سالہ حمزہ کی انگلی تھامی۔

تیمور کو گاڑی کا لاک کھولتے دیکھ کر وہ چکرا کر رہ گئی۔

”کیا آپ بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں؟“

”میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا بلکہ آپ میرے ساتھ جا رہی ہیں محترم خاتون صاحبہ!“ اس کی بات پر وہ چڑھ گئی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ آبی ہی نہ۔

”میری گاڑی کافی دنوں سے گڑبڑ کر رہی ہے۔ میں نے اس لئے تیمور کو روک لیا تاکہ شاپنگ کرنے میں تو آسانی رہے۔ ورنہ یہ ٹورک ہی نہیں رہا تھا۔“ سندس آبی اسے بتا رہی تھیں۔ ”کاش نہ ہی رکتا۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بڑبڑاتی۔

اور پھر انہیں شاپنگ کرتا دیکھ کر تیمور پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ انہیں کوئی چیز پسند ہی نہ آ رہی تھیں اگر سندس آبی کوئی جوتا پسند کرتیں تو صبا مسٹر دکر دیتی اور اگر صبا کوئی سوٹ پسند کرتی تو سندس آبی کو اس میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آ جاتی۔

”تم لوگوں کو ایک جگہ سے چیز پسند نہیں آتی۔“ وہ ایک بوتیک میں گھسی ڈریس پسند کر رہی تھیں جب تیمور نے دانت کچکا کر کہا۔

”آپ کو کیا ہے؟“ صبا اسے خاطر میں لائے بغیر بولی۔

”پہننا ہم نے ہے کہ آپ نے؟“ ”بس یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے ایک سی گرین کلر کے سوٹ پہ ہاتھ رکھ کر کہا جس پہ ہم رنگ دھاگے کا بالکا لکا کام ہوا تھا۔

”لیکن اس کی کڑھائی تو۔۔۔۔۔“ صبا نے اعتراض کرنا چاہا۔

”میں نے کہہ دیا ناں بس۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا پھر سبز مین کو اسے پیک کرنے

کے لئے کہا۔ پھر یہی نہیں اس نے ہر چیز اپنی پسند سے بلکہ دھونس سے نہ صرف اس نے آبی کو بلکہ اسے بھی ایسے ہی دلائی۔ مارے غصے کے صبا کا برا حال تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ایسے کھری کھری ستائی کہ موصوف کی طبیعت صاف ہو جائے لیکن سندس آبی کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئی۔

جیسے یہ شاپنگ کر کے وہ مارکیٹ سے باہر نکلے سندس آبی کو اپنی کوئی جاننے والی لگیں۔ ”صبا! تم حمزہ کو لے جا کر گاڑی میں بٹھاؤ تھک گیا ہے میں ابھی آئی ہوں۔“ وہ صبا سے مخاطب ہوئیں تو صبا شکر کا کلمہ پڑھتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

”خواتین کی شاپنگ کے بارے میں سنا تھا آج تجربہ بھی ہو گیا۔ اف میرے اللہ! میں تو آ کر پچھتا گیا۔“ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”تو کس نے ہاتھ جوڑے تھے ہمارے ساتھ آنے کے، نہ آتے۔“ صبا کو نئے سرے سے اپنا غصہ یاد آنے لگا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرا ایک حشر ہو گیا تو ہرگز نہ آتا۔“ وہ شاپنگ بیگ گاڑی میں رکھتے ہوئے بولا۔

”بالکل اسی طرح اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کی سواری بادی بیماری ہمارے ساتھ جارہی ہے تو میں ہرگز نہ آتی۔“ ادھر رکھنے کا اسے بھی کوئی خاص شوق نہ تھا۔

”یہ تم ہر وقت مرجیں کیوں چپاتی رہتی ہو؟“ وہ اب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

”اور خود تو جیسے ہر وقت شکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔“ دو دو بدو بولی تیمور کا قبچہہ بے ساختہ تھا۔

”تم کہو تو یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔“ اس کا لہجہ بڑا ذومعنی تھا۔ صبا کچھ کینوزی ہو گئی۔

”میں خواہ مخواہ کہوں۔“ اس نے بظاہر

لا پرواہی سے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگلی دفعہ آؤں تو می کو لے کر آؤں کیا خیال ہے؟“ وہ اب گردن موڑ کر اس سے مخاطب ہوا تو وہ حقیقی معنوں میں سٹیٹا گئی۔

”میری بلا سے پورے محلے کو لے آئیں۔“ بے نیازی سے کہتی وہ باہر دیکھنے لگی۔

”پورا محلہ اگر تمہیں یہاں دیکھنے آئے تو بڑا عجیب سا لگے گا تم ہی وہاں چلی جانا تا کہ سب تمہیں وہیں دیکھ لیں۔“ وہ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبا کر بولا۔

”آپ.....“ مارے غصے کے سارے الفاظ کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئے اس نے غصے سے اسے ٹھوڑا چاہا لیکن کچھ تھا ضرور اس کی آنکھوں میں کہ صبا نے جزیر ہو کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ تیمور کے لبوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

”چلو تیمور! بڑی مشکل سے جان چھڑوائی ہے۔“ سندس آبی بیٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

سندس آبی تو اسے اصرار کر کے کھانے پہ روک رہی تھیں لیکن تیمور کی نگاہیں اسے کافی ڈسٹرب کر رہی تھیں لہذا وہ معذرت کر کے کھڑی ہو گئی۔

حمزہ سوچا تھا سندس آبی اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہ صبح نے پہ رکھے ہوئے اپنے شاپنگ بیگ اٹھانے لگی۔

”صبا! مذاق اپنی جگہ، بٹ آئمر سیر لیس۔“ میں واقعی اپنے پیرئیس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔“ وہ ایک دم ہی اس کے سامنے آ گیا۔

”راستہ دیں۔“ اس نے بمشکل تھوک نکل کر کہا۔

”آپ پہلے جواب دیں۔“ وہ ہنوز اس پہ نظریں جمائے کھڑا تھا۔

”جواب میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ قصداً اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”پھر کس کے پاس ہے؟“ اس نے دہری سے اس کے چہرے کو دیکھا جو اس کی نظروں سے حدت سے گامی ہو رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم، پیچھے ہٹیں، مجھے گھر جانا ہے۔“ اس نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹانا چاہا لیکن وہ اسے ایک انچ بھی نہ ہلا سکی بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”پہلے تو بڑی بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہی تھیں اب کیا ہوا؟ یوٹی کیوں بند ہو گئی ہے؟“ اس کا انداز سر اسر چڑانے والا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ میرے منہ میں زبان نہیں۔“ اس کی ازلی خود سری عود کر آئی۔

”مجھے ناچیز کی کیسے اتنی ہمت ہو سکتی ہے ایسا الٹا سیدھا خیال رکھنے کی۔“ اس کے لہجے میں مسکینیت چمکتی تھی۔

”ہاں! ایسے ہی بھولے ہیں ناں آپ۔“ اس نے طنز آکھا۔

”بھولا بھالا ہی تو ہوں چچی تو تم جیسی پاگل لڑکی کو.....“

”کیا میں پاگل ہوں؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر چلائی۔

”آپ کیوں پاگل ہونے لگیں ہمیں جو بنا رکھا ہے۔“ وہ پھر بڑی سے اترنے لگا۔

”راستہ دیں ورنہ میں سندس آبی کو آواز دے دوں گی۔“ اس کی دھمکی کافی کارگر ثابت ہوئی تھی وہ اسے گھورتا ہوا ایک سائیڈ پہ ہو گیا۔

”میری پسند کی چیزیں لینے کا شکریہ۔“ اپنے پیچھے اسے تیمور کی آواز سنائی دی تو وہ شور مچاتے دل کو سنبھالتے باہر نکل آئی۔

آج شام پانچ بجے ہمایوں کی فلائٹ تھی۔ نعت کدہ کے تمام افراد ہی خاصے پر جوش تھے

کیونکہ پہلی دفعہ پچھو کے گھر سے کوئی آ رہا تھا۔

خدیجہ پچھو اپنی شادی کے دو سال بعد جب ہمایوں چھ ماہ کا تھا اپنے شوہر کے پاس امریکہ چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد وہاں جا کر ایک مصروف ہوئیں کہ پاکستان آنے کا وقت ہی نہ ملا۔

البتہ ٹیلیفون پر ان سے رابطہ رہتا تھا۔ ہر عید پر وہ انہیں کارڈز اور گفٹ دینا نہ بھولتی تھیں اس طرح نعت کدہ بھی ہر موقع پر انہیں یاد رکھتا تھا۔

بڑے تایا، چھوٹے تایا اور علی، ہمایوں کو ریو کر نے ایئر پورٹ جا چکے تھے۔ جب کہ بڑی امی نے صبح سے ان کو بچن میں گھسا رکھا تھا۔ سستی کی ماری یعنی سب سے زیادہ کھجھلائی ہوئی تھی۔

پڑھائی کا بہانہ بنا کر اسے ہمیشہ ہی رعایت مل جاتی تھی لیکن آج تو ناممکن سا لگ رہا تھا۔

زین ابھی بچن میں داخل ہوا تھا۔ یعنی کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ اٹھ آئی۔

”بڑی امی! وہ انسان ہے کوئی خدائی مخلوق نہیں۔“ وہ یہاں ملنے آ رہا ہے کھانے نہیں آ رہا کوئی چیز کل کے لئے بھی چھوڑ دیں۔“ بڑی امی نے یعنی کو کو فتنے فرمائی کرنے کے لئے کہا تو وہ تپ گئی۔

”کھانے نہیں آ رہا تو فاقے کاٹنے کے لئے بھی نہیں آ رہا۔“ ہمیں ٹوبس ذرا سا کام کہہ دو تو موت نظر آنے لگتی ہے رومی اور صبا بھی تو ہیں چلو جلدی سے کو فتنے فرمائی کرو ان کے آنے سے پہلے۔“ وہ حکم صادر کرنی باہر نکل گئیں تو یعنی رو ہانسی ہو گئی۔

”چہ..... چہ..... یہ ذرا سا کام تم سے نہیں ہوتا۔“ زین نے اس کی حالت پہ افسوس کیا۔

”مجھ سے نہیں ہوتا کام وام، مجھے کام کرنے سے نفرت ہے۔“ اس نے دانت پیس کر کہا زین نے زبردست قبچہہ لگایا۔

”چلو جاؤ تم، میں فرانی کر لیتا ہوں، اس طرح بریکس چھی ہو جائے گی۔“
”بریکس کس بات کی؟“ اس کی آفر پہ وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

”بھئی سیدی سی بات ہے کل کو اگر ہمارے جیسے کوئی چھو ہڑل کر ل گئی تو میرا کیا بنے گا لہذا بہتر یہی ہے کہ پہلے سے ہی اپنے آپ کو تیار کر لیا جائے۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ شرارت سے گویا ہوا۔

”زین! میں تمہیں چھوڑ گئی ہوں؟“ اسے بس ایک بات ہی سمجھ میں آئی تھی۔

”تو اور کیا تمہیں راحت کہوں؟“ وہ بھی لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا تو عینی کو ہنسی آ گئی۔

”افوہ! باتوں میں پتہ ہی نہیں چلاکتی دیر ہو گئی ہے اگر بڑی امی آئیں تو خیر نہیں۔“ اس نے جلدی سے برز جلا کر کڑا ہی اوپر رکھی اور کویتے فرانی کرنے لگی۔ رومی اور صبا غالباً اوپر جا چکی تھیں۔

پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب ایئر پورٹ سے واپس آ چکے تھے۔ پہلے گھر کے بڑے افراد ہمایوں سے ملے تھے تھوڑی دیر بعد بنگ جنریشن اس کے گرد جمع تھی اور تعارف کر مرحلہ گزر رہا تھا۔ علی چونکہ اس سے ایئر پورٹ پہ ہی تعارف حاصل کر چکا تھا لہذا وہ اب ان سب کا تعارف کروا رہا تھا۔ صفی، زین اور شہزاد کے بعد وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ نور اعین ہے اور یہ رومیہ ہے، یہ صبا جیت ہے۔“ وہ تینوں ایک ہی صوفے پہ بٹھ گئی تھیں علی نے اشارے سے ان تینوں کی اسے متوجہ کیا۔ ہمایوں نے کچھ چونک کر صبا کی طرف دیکھا کانوں میں ممبا کے الفاظ گونجنے لگے۔

”تمہارے بڑے ماموں کی بیٹی صباحت! کبھ گئے ناں؟“ اور اس وقت اس نے بڑے

زور و شور سے سر ہلایا تھا۔

”آپ پہلی دفعہ پاکستان آئے ہیں؟“ عینی کے سوال پہ رومی کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے کل سے بڑی امی کوئی سات نو مرتبہ بتا چکی تھیں کہ ہمایوں پہلی دفعہ آ رہا ہے پاکستان۔

”ہوں..... لیکن آپ سب کو دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا۔“ وہ گفتگو سے مسکرایا۔

”کیوں..... وہاں آپ کے ریلیو ز نہیں ہیں؟“ صبا نے پوچھا۔

”میرے ایک چاچا اور پچھو امریکہ میں ہی ہوتے ہیں لیکن آنا جانا ذرا کم ہی ہوتا ہے۔“ وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو بچو باقی باتیں بعد میں کر لینا پہلے ڈنر کرو۔“ بچی جان نے اندر آتے ہوئے کہا تو وہ سب کھڑے ہو گئے۔ کھانا نہایت بے تکلفی کے ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ہمایوں بھی ان کی طرح شوخ مزاج اور ہنس کھنکھم کا لڑکا تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس درواں ہمایوں ان سب کو پچھو کے متعلق بتاتا رہا۔

”اب کافی ٹائم ہو گیا ہے اس لئے سونے کی تیاری کرو۔ باقی باتیں صبح کر لینا۔ ہمایوں تھک گیا ہو گا اسے بھی آرام کرنے دو۔“ بتایا ابا اٹھتے ہوئے بولے تو ان سب کو بھی احساس ہوا واقعی کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ سب جمائیاں روکتے اپنے اپنے گمروں میں سونے کے لئے چل دیئے۔

اگلی صبح ہمایوں کی آنکھ کھلی تو وال کلاک گیارہ بج رہا تھا۔ اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ نہا دھو کر فریش ہو کے وہ باہر نکلا تو سب سے پہلے بڑی امی سے سامنا ہوا۔

”اٹھ گیا میرا نعل! نیند تو آ گئی تھی ناں۔“

وہ اپنے مخصوص پر شفقت لہجے میں بولیں۔
”جی۔“ سعادت مندی سے کہتا وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”رومی! بیٹا ناشتہ لاؤ ہمایوں کے لئے۔“ انہوں نے رومی کو آواز دی۔

”کیا لیں گے آپ ناشتے میں، پرائیڈ، انڈہ، توس، دودھ، چائے۔“ وہ ایک سانس میں ہی پوچھتی چلی گئی۔

”جول جائے وہی کھا لوں گا۔“ اس کی کسر نفی پہ وہ مسکراتے ہوئے پچن میں چلی گئی۔

”آپ لوگوں نے ناشتہ کر لیا۔“ وہ جونہی ناشتے کی ٹرے لے کر آئی ہمایوں پوچھ بیٹھا۔

”جی ہاں کیونکہ پانی معاملات میں چاہے ہمارے گھر میں بے ترتیبی رہ جائے لیکن کھانا ہمیشہ وقت پر کھایا جائے گا کیونکہ ایک سے بڑھ کر ایک بھوکا تو اس گھر میں موجود ہے۔“ اس کی بات پر وہ ہنس پڑا تھا جب کہ بڑی امی نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا جس کا حسب معمول اس پہ مطلق اثر نہ ہوا۔

”باقی سب افراد کہاں ہیں نظر نہیں آ رہے۔“ غیر معمولی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”بچی جان، عینی اور شہزاد تو صبح ہی کالج چلے جاتے ہیں زین یونیورسٹی میں اور تایا ابا ابو جان اور بیچا جان اور علی آفس میں جب کہ صفی کا کوئی پتہ نہیں کہاں مٹر گشت کر رہا ہو گا۔“ رومی نے تفصیل بتائی۔

”کیوں..... وہ فارغ ہی ہوتا ہے؟“ ہمایوں نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

”نی الحال کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ جب تک اس کا ایم اے کا رزلٹ نہ آ جائے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ آخر کو دوسری مرتبہ تو بیچارے نے ایگزامز دیئے ہیں بقول صفی کے کہ پہلی مرتبہ تو قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔“ وہ شروع ہو چکی

تھی۔

”رومی! ذرا میری دوائیاں تو لا دو رات کو علی لایا تھا شاید اسی کے کمرے میں پڑی ہوں۔“ بڑی امی نے اسے وہاں اٹھایا ورنہ نہ جانے اور کتنے ”خوبصورت انکشاف“ کر دیتی۔

”ایک تو ہماری اولادیں بھی جاہل ہیں پتہ نہیں کب منتقل آئے گی۔“ انہوں نے کس کس سوچا۔ ہمایوں نے ناشتہ کر لیا تو وہ برتن اٹھا کر پچن میں چلی گئیں۔

”رومی! کل جو میں نے تمہیں سی ڈی پکڑائی تھی وہ کہاں رکھی ہے۔“ صبا ایک ہی جست میں دو، دو میٹرھیاں پھلاکتی نیچے آ رہی تھی۔ سامنے صوفے پر ہمایوں کو براجمان دیکھ کر جل سی ہو گئی۔

”اٹھ گئے آپ؟ ناشتہ کر لیا؟“ خجالت مٹانے کو اس نے فوراً پوچھا۔

”جی..... ابھی ابھی کیا ہے۔“ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”نیند ٹھیک طرح سے آ گئی تھی۔“ اچھو کی بی بی جگہ پہ انسان تھوڑا ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ناں اور آپ تو پہلی دفعہ پاکستان آئے ہیں۔“ وہ اب اس کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔

”بالکل ٹھیک طرح سے نیند آئی تھی۔ مجھے تو ایک دفعہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ میں اجنبی جگہ پر، اجنبی لوگوں کے درمیان ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”یہ تو آپ کی محبت ہے جو آپ اس طرح محسوس کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”اس میں کافی حد تک آپ سب کی اپنائیت کا ہی ہاتھ ہے۔“ اس نے جوابا کہا۔

”تعریف کے بدلے میں تعریف کر کے بدلہ اتار رہے ہیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”نہیں بلکہ کر بھلا ہو بھلا کے فارمولے پر عمل کر رہا ہوں۔“ اس کا جواب بڑا بے ساختہ تھا۔

”آپ کی اردو کافی اچھی ہے۔“ وہ واقعی متاثر ہوئی تھی۔

”اب میں آپ کی تعریف کروں یا نہ؟“ شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔ ہمایوں کو لگا کہ اس کا آنا بے کار نہیں گیا۔

”اے لڑکی! کہاں بھاگی جا رہی ہو ذرا چھری تلے دم تو لو۔“ یعنی اپنی رو میں بھاگتی ہوئی اندر چار رہی تھی جب پوری فوت سے زین سے ٹکرائی۔

”افوہ..... زین! تم تو پیچھے بٹو۔“ اس نے جھنجھلا کر اسے پرے دھکیلا اور اسی رفتار سے بھاگتی ہوئی غڑا پ سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اندر آ کر اس نے سب سے پہلے ریڈیو آف کیا۔

”اوہو..... یعنی! ریڈیو کیوں بند کیا ہے میرا پسندیدہ پروگرام آنے والا ہے۔“ صبا نے گھور کر یعنی کو دیکھا۔

”پہلے میری بات سن لو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“ وہ اس کی گھوری کو نظر انداز کر کے بولی۔

”کیوں ایسی کون سی خاص بات ہو گئی ہے۔“ رومی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”تمہیں پتہ ہے ہمایوں پاکستان کیوں آئے ہیں؟“ اس کے لہجے کو راز دارانہ بنایا۔ رومی اور صبا کے سر فنی میں ملے تھے۔

”میں ابھی ابھی سن گئی ہوں بڑی امی اور تاپا ایسا تپا کر رہے تھے کہ خدیجہ پیچھو جب امریکہ گئی تھیں انہوں نے بڑی امی اور تاپا ایسا کہا تھا کہ وہ صبا کو اپنے ہمایوں کی دہن بنائیں گی۔ اسی لئے ہمایوں بھائی پاکستان آئے ہیں۔“ عینی کے انکشاف پر صبا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”اوہو۔“ رومی نے معنی خیز نظروں سے صبا کو دیکھا۔

”تو محترمہ صباحت صاحبہ! اب آپ کی بوریت یقیناً ختم ہو جائے گی کیونکہ عنقریب ہمارے گھر میں بھی ایک فنکشن ہونے والا ہے۔ دیکھ لو تمہاری دعا گئی جلدی قبول ہوگئی۔ کیا خیال ہے پھر آئندہ بقرہ عید پر تمہاری رخصتی نہ کروادوں وہ بھی امریکہ۔“ وہ شرارت سے اس کی طرف دیکھتی پوچھ رہی تھی جب کہ صبا غائب دماغی سے اپنے دیکھ گئی اس کا دماغ ابھی تک سائیں سائیں کر رہا تھا۔

”میں واقعی اپنے چیرنٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔“ کسی کا گھمبیر لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تو وہ گھبرا گئی۔ رومی اور عینی اپنے ہی بیان بنا رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

”بچی شر مار رہی ہو۔“ اپنے پیچھے اسے رومی کی آواز سنائی دی تھی۔

پتہ نہیں کیا بات تھی حالانکہ اس کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ ہمایوں جیسا بینڈم، پڑھا لکھا شخص اس کا شریک سفر بننے جا رہا تھا۔ لیکن وہ خوش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید گزرتے دنوں میں اس نے تیور کو بہت سوچا تھا شاید وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کے درد پر دستک دی تھی یا شاید اس کے جذبے ہی اتنے گھرے تھے کہ وہ بے خیالی میں نجانے کیا کچھ سوچ چکی تھی۔ کہنے کو تو بہت باتیں ہو سکتی تھیں لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کا اپنا دل بھی تیور کی طرف ہمک رہا تھا۔

”لیکن ہمایوں.....“ سوالیہ نشان بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔

ہمایوں اور علی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آئے تھے۔ علی آج اسے اپنی فیکٹری دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔ واپسی میں ایک، دو مشہور جگہیں

اسے دکھاتے ہوئے وہ گھر لوٹا تھا۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ جونہی اندر داخل ہوئے تو ایک دم ہی ٹھٹھک کر رک گئے۔ عین سامنے رکھے صوفے پر رومی اپنے ارد گرد سے بے نیاز نیند کی وادیوں میں کم تھی۔ دوپٹہ صوفے کی پشت پر پڑا تھا۔ لمبے سیاہ بال بے ترتیبی سے بھرے تھے جو اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ بلیک اور بلیو پرنٹڈ سوٹ میں ہم رنگ چوڑیاں کلائی میں پہنے وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔ ہمایوں نے اپنی زندگی میں حسن تو بہت دیکھا تھا لیکن یوں ”مدہوش حسن“ آج پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ہمایوں کی محویت علی کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

اب پتہ نہیں ہے چار، نگاہوں کا اثر تھا یا کوئی اور بات رومی نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر وہ اٹھ گئی تھی لیکن پوری طرح نیند سے بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ہمایوں نے ہمیشہ اس کو دوپٹے میں ہی دیکھا تھا۔ سر ڈھانپے ہوئے۔ اسے کچھ عجیب سا تھلکا تھا لیکن چند دن یہاں رہنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بڑے ماموں اور مامی خاصی سخت طبیعت کے مالک ہیں اور لڑکیوں کی بے جا آزادی کے سخت خلاف تھے۔

علی کی غصیلی نظروں کے تعاقب میں اس نے دیکھا تو فوراً اپنے حلیے کا احساس ہوا۔ صوفے کی پشت سے دوپٹہ اٹھا کر اس نے جلدی سے اوڑھ لیا۔

”آپ لوگ کب آئے؟“ اپنے جاگنے کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔ حالانکہ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار ابھی بھی بلکورے لے رہا تھا۔ ہمایوں کو اپنی ہارٹ بیٹ مس ہوئی محسوس ہوئی۔

”ابھی ابھی.....“ جائے مل سکتی ہے؟“ علی کا بس نہیں چل رہا تھا جیسی طریقے سے اسے

یہاں سے غائب کر دے۔ ہمایوں کا لحاظ کر کے اس نے کوئی بھی سخت بات نہیں کہی تھی۔ جواباً اثبات میں سر ہلاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ”لوہے گھر میں سے سونے کے لئے تمہیں یہی ایک جگہ ملی۔“ وہ چائے کا پانی رکھ رہی تھی جب اپنے پیچھے علی کی آواز سنائی دی۔ ”تیس جان بو بھڑ کر تھوڑی سوئی تھی۔ میں تو نہا کر آئی تھی۔ وہیں بیٹھ کر بڑی امی سے باتیں کر رہی تھی، پتہ ہی نہیں چلا کب نیند آ گئی۔“ برز جلاتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم تو اپنے آپ سے بے نیاز لیٹی تھی تمہاری بلا سے جو مرضی اندر آ جائے۔“ اسے دفعہ اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ ”کوئی آیا تو نہیں ناں۔“ اس نے نیازی سے کہا۔

”اچھا..... ابھی ”کوئی“ نہیں آیا۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ چونک گئی۔ ”تم اور ہمایوں ہی تھے اور وہ بھی تو میرا کزن ہی ہے تمہاری طرح۔“

”تم ہمایوں کو مجھ سے کیوں کمپیئر کر رہے ہو۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

”میں نے تمہیں کب کمپیئر کیا ہے علی!“ نیند سے بھاری پپوٹوں اور خمار آلود نگاہوں میں حیرت تیرنے لگی تھی۔ علی چند لمحے بے خود سا اسے دیکھنے لگا۔

”ایک بات تو بتاؤ، تمہیں مجھ میں اور باقی تمام کزنز میں کوئی فرق نہیں آتا۔“ اس نے بھاری لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں۔“ وہ نظریں چرا گئی۔

”جھوٹ مت بولو۔“ اس کے لبوں پہ بڑی دلفریب سی مسکراہٹ ٹھہر گئی رومی کا چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ علی نے خاصی دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”علی!“ وہ اس کی نظروں کی حدت سے گھبرا گئی۔
 ”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو، میں کنفیوز ہو رہی ہوں۔“
 ”پھر کیسے دیکھوں کہ تم کنفیوز نہ ہو۔“ وہ شرارت سے بولا۔
 ”مجھے نہیں پتہ، تم نکلو یہاں سے۔“ اس نے اسے پرے دھکیلا۔
 ”دھکے تو مت دو ظالم لڑکی! چلا جاتا ہوں۔“ وہ احتجاجاً چلا آیا۔
 ”لالتوں کے بیھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“ وہ اسے چڑائی ہوئی دوبارہ کیتلی میں پانی انڈیلنے لگی۔ جو باتوں کے دوران آدھا رہ گیا تھا۔

 آج اتوار کا دن تھا چھٹی ہونے کی باعث وہ سب گھر پہنچے تھے۔ سنگ روم میں سب کی محفل جمی تھی۔ کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں اور جب مرد حضرات کی ساری گفتگو ”بزنس“ کے گرد گھومنے لگی تو وہ تینوں اکٹائیں۔
 ”بیٹا! اچھی سی چائے ہی پلا دو۔“ چچا جان ان کی بیزار شکلیں دیکھ رہے تھے لہذا بہانے سے اٹھادیا وہ تینوں بھی فوراً اٹھ گئیں۔
 ”تم کہاں جا رہے ہو بخودار!“ صفی کو اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ کر تایا ابا نے سخت لہجے میں پوچھا۔
 ”نہیں بھی نہیں، بس ویسے ہی ٹانگیں ذرا اکڑی گئیں تھیں۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔
 ”سارا دن آوارہ گردی کرتے تو کبھی ٹانگیں نہیں اکڑیں۔“ تایا ابا کے درشت لہجے پر وہ جی بھر کے بد مزہ ہوا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ اتنی تھیں قسم کی گفتگو سن رہا تھا جو اسے ہرگز ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
 ”چلو صبا! اب چائے تم اندر دے کر آؤ۔“

چائے کے ساتھ پیسٹر اور کیک ٹرائی میں رکھتے ہوئے رومی نے صبا سے کہا۔
 ”میں نہیں جا رہی تم ہی دے آؤ پلیز۔“ اس کا انداز بھی تھا۔
 ”تم نے تو ابھی سے شرمانا شروع کر دیا۔“ رومی کے شوخ لہجے پر وہ بوہمی رخ موڑ کر فریج کھول کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ اب اسے کیا بتانی کہ وہ تو ہمایوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی کس قدر تھی۔ اس وقت اس کی حالت خود اپنی سمجھ سے باہر تھی کسی دوسرے سے کیا شبہ کرتی۔
 ”یہاں کا سسٹم مجھے تو بڑا عجیب سا لگتا ہے ہر جگہ یہ بدھ کی سی ہے رولز اینڈ ریگولیشنز تو نام کے بھی نہیں۔ ہر شخص کو صرف اپنی پڑی ہے۔ پڑھے لکھے اور چائلز برابر ہیں کوئی بھی ان میں تمیز نہیں کر سکتا۔“ وہ چائے لے کر اندر پہنچی تو ہمایوں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔
 ”لیکن بیٹا! یہ باتیں تم سب پاکستانیوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ یہاں پر بہت سے ویل منیجر لوگ بھی ہیں۔“ تایا ابا کی اپنے ملک سے ازلی محبت عود کر آئی تھی۔
 ”آپ کی بات بھی ٹھیک ہے ماموں جان!“ وہ اسے موقف پر ہی ڈٹا رہا۔
 ”آپ ٹوک بھی امریکہ چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں وہاں ہر بات میں ہر چیز میں آپ کو ڈسپلن نظر آئے گا۔“
 ”ٹھیک ہے ہر ملک کے اپنے اصول و ضوابط ہوتے ہیں لیکن ہمایوں! ہر ملک میں اچھائی اور برائی بھی ہوتی ہے تم صرف اچھائی کو مد نظر رکھ رہے ہو اور برائی کو نظر انداز کر رہے ہو۔“ علی بھی گفتگو میں شریک ہوا۔
 ”میں وہاں کی برائیوں کو انور نہیں کر رہا لیکن تم خود آبرو کر لو وہاں کے جتنے بھی ویک پوائنٹس ہیں وہ یہاں بھی موجود ہیں۔“ رومی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی ہوئی چائے سرو کر

رہی تھی۔
 ”یہی تو ہمارا سب سے بڑا ویک پوائنٹ ہے کہ ہم ان لوگوں کو فائدہ بھی کرتے ہیں تو صرف مذمتی باتوں میں۔“ چچا جان کے لہجے میں افسوس جھلک رہا تھا۔
 ”یہ بات ہی تو میں سمجھنا چاہ رہا ہوں۔ کہ آج کے پاکستانی بھی اتنے براڈ مائنڈ ہو گئے ہیں کہ امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے اپنے گھر کا ماحول تھوڑا نائیٹ رکھا ہے تو یہ آپ کی ذاتی کاوش ہے اس میں ماحول کا اتنا عمل دخل نہیں اور اگر آپ چاہیں تو یہ ماحول کسی بھی ملک میں رہنے کے باوجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔“ ہمایوں نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔
 ”تم کہنا چاہتے ہو کہ ہمیں پاکستان کی بجائے امریکہ میں جا کر رہنا چاہیے۔“ اس ساری بحث سے صفی یہی نتیجہ اخذ کر پایا تھا۔
 ”بالکل۔“ اس نے چائے کا سیپ لیتے ہوئے کہا۔
 ”اب دیکھو ناں وہاں کی ہر چیز کا ایک سینیئر ڈسٹری بیوٹرز کا معیار زندگی بالکل ڈفرنٹ ہے۔ ایک اچھی لائف گزارنے کے لئے وہاں ہر قسم کی فسلٹیز ہیں۔ جب کہ یہاں کی لائف تو بالکل اس کے الٹ ہے۔ ہر طرف ایک بے تربیتی سی ہے، جگہ جگہ گندگی، کوڑے کے ڈھیر اور فضائی آلودگی اتنی بڑھ چکی ہے کہ۔۔۔۔۔“
 ”ایک منٹ ہمایوں صاحب!“ رومی بے اختیار ہی اسے ٹوک گئی وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”یہ جو دھرتی ہے ناں خواہ صاف ستھری ہو یا گندی سندی، یہ ہمیں بہت عزیز ہے اس لئے کہ اسے کوئیس نے اتفاقاً نہیں دریافت کیا بلکہ یہاں کے ایک ایک ذرے میں ہمارے بزرگوں کا خون رچا ہوا ہے یہ ہمیں بالکل اپنی ماں کی طرح عزیز ہے اور اپنی ماں کی طرح ہی ہم اس سے

عقیدت رکھتے ہیں، ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے آپ اسے ہماری مجبوری سمجھ لیں ہمارے ایک بہت اچھے لکھنے والے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی وہ کہتے ہیں کہ اگر ماں، میلی پھلی اور جھروں زہد چہرہ والی ہو تو کیا ہم اسے چھوڑ کر الزبتھ ٹیلر کو اپنی ماں تسلیم کر لیں گے؟ نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ناں جس طرح اپنی سگی ماں کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کی والدہ کو اپنی ماں نہیں بنا سکتے اسی طرح ہم اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسروں کے ملک کو اپنا ملک تسلیم نہیں کر سکتے۔“ اس کا لہجہ قاطعیت لئے ہوئے تھا۔ تایا ابا کا سر فخر سے بلند ہو گیا پانی سب کی آنکھوں میں بھی اس کے لئے ستائش ابھری تھی۔ جب کہ ہمایوں اپنی پرسوج نگاہیں اس پہ جمائے مستقل کچھ سوچے جا رہا تھا۔

 ”علی! مجھے چھوڑ آؤ نا پلیز۔“ رومی کی فریڈ کی شادی تھی۔ اس نے اتنا اصرار کیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے رومی کو چانا پڑ رہا تھا۔ وہ تیار ہو کر اب علی کی منتیں کر رہی تھی۔ ویسے اگر وہ چاہتی تو صفی، زین یا شہزاد کسی بھی کہہ سکتی تھی اور وہ اسے چھوڑ آئے۔ لیکن وہ تینوں لا رواہ سی طبیعت کے مالک تھے جب کہ علی کی موجودگی میں اسے تحفظ کا ایک احساس رہتا تھا۔
 ”اچھی تم نے مارکیٹ بھی جانا ہے پہلے رستے میں اس کے لئے گفٹ خریدو گی، بیگ کرواؤ گی۔ پھر کہیں اپنی دوست کے گھر پہنچو گی اور واپسی کے لئے پھر ایک درد سر۔“ وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا۔
 ”میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی علی! جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔“
 ”جانتا ہوں تمہاری تھوڑی دیر، چھ گھنٹے سے پہلے اٹھنے والی نہیں تم اور مجھے ابھی ایک ضروری میٹنگ میں بھی شرکت کرنا ہے۔“ وہ جیسے مزہ لے رہا تھا۔

”مرو تم، اب بات مت کرنا مجھ سے۔“ وہ چند سیکنڈ اسے گھورنے کے بعد دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں۔ اس کا غصہ سے سرخ چہرہ علی کو لطف دے گیا وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ جانتا تھا تھوڑی دیر بعد وہ پھر خود ہی آجائے گی۔

”ہمایوں! صبح آپ نے ابو جان سے گاڑی کی چابی لی تھی۔“ وہ ہمایوں کے کمرے میں داخل ہو کر پوچھ رہی تھی۔ ہمایوں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور گویا نگاہیں پلٹنا بھول گئی تھیں۔ ایک تو تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے دوسرا غصے سے اس کی گلابی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ ڈیپ پنک کمر کے سوٹ میں لائٹ سائیک اپ کینے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہمایوں مبہوت سا ہو گیا۔

”میری دوست کی شادی ہے اگر آپ فارغ ہیں تو مجھے اس کے گھر تک چھوڑ آئیں گے؟“ اس نے کچھ جھجک کر پوچھا تھا کیا پتہ وہ مانتی ہی نہ کر جائے۔

”لیس..... وائے ناٹ۔ اس مائی پلیئر۔“ وہ ایک دم ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

ان دنوں کو ایک ساتھ سیڑھیاں اترتے دیکھ کر علی گنگ رہ گیا تھا۔ اسے رومی سے اس رد عمل کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ناگواری کی شدید لہر اسے اپنی پلیٹ میں لے رہی تھی۔ مگر مشکل یہ ضبط کر کے اس نے خود کو کچھ بھی کہنے اور کرنے سے باز رکھا تھا۔

”ہیل مارکیٹ تک جانا ہے مجھے ابھی گفت بھی خریدنا ہے۔“ ہمایوں ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم کہو تو میں افق کے پار جانے کو بھی تیار ہوں۔“ اس کی بات پر رومی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ہمایوں ایک پل کو گھبرا گیا۔ جب کہ وہ علی کو چڑا کر اتنا خوش ہو رہی تھی کہ ہمایوں کا لہجہ اور

نگاہیں محسوس نہ کر سکی۔

نام کافی ہو رہا تھا لہذا اس نے جلد ہی ایک گفت پسند کر کے پیک کرنے کو کہا۔ گفت لے کر وہ باہر نکلے تو ہمایوں سے ایک جیولر کی شاپ میں لے گیا۔

”میں نے بھی کسی کے لئے گفت خریدنا ہے میری بھی ہیلپ کرو۔“ اس کے استحقاق بھرے لہجے پر وہ مسکرا دی۔ یقیناً صبا کے لئے کوئی چیز لینی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

”لیکن یہ گفت دینا کسے ہے؟“ دل میں مچلتے سوال کو وہ یوں تک لے ہی آئی۔

”اک نہایت ہی دلچیز بہتی کو۔“ اس کی بات پر رومی کا خیال، یقین میں بدل گیا۔ صبا کو بریسلٹ بہت پسند تھا۔ اس نے ایک نازک بریسلٹ پسند کر ہی لیا۔

”اب جلدی چلیں دیر ہو رہی ہے۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

”واپسی پہ لینے آؤں؟“ مطلوبہ گھر کے سامنے پر یک لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”اگر زحمت نہ ہو تو۔“ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ڈونٹ بی فارل یار!“ وہ تھوڑا سا جھلا گیا۔

”ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ یہیں ملیں مجھے۔“ وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔

”یہ صبا آج کل بہت گم صم رہے گی ہے شاید مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔“ میگنیز کے اوراق بے دلی سے پلٹتے ہوئے اس کا ذہن صبا کے گود گھوم رہا تھا۔

”کہاں تم ہو بھئی۔“ ہمایوں اس کے قریب آ کر بیٹھا تو وہ چونک گئی غیر محسوس انداز میں وہ آگے کھسک گئی۔ ہمایوں کی نظروں سے اس کی حرکت پوشیدہ نہ رہی تھی۔

”ایک بات کہوں تم سے رومی!“ چند سیکنڈ اسے بغور دیکھنے کے بعد وہ گویا ہوا۔

”کیا؟“ اس کی گہری نظریں رومی کے الجھن میں مبتلا رہی تھیں۔ اس نے نہایت سہولت سے رومی کی کلائی پکڑی اور جہیز کی پاکٹ سے بریسلٹ نکالا۔

”یہ تمہارے لئے ہے۔“ وہ بریسلٹ اس کی کلائی کی زینت بنا چکا تھا رومی گنگ رہ گئی۔

”لیکن یہ..... تو صبا۔“ مارے حیرت اور صدمے کے الفاظ رومی کے حلق میں انگ کر رہ گئے۔

”یہ ٹھیک ہے کمی نے صبا کے لئے کہا تھا لیکن انہوں نے فیصلہ میرے سپرد کیا تھا اور میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“ وہ کہہ کر رکائیں تھالے لے بے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”رومی! پاپی تو پلاؤ۔“ اتنے میں علی کمرے میں داخل ہوا اور صوفے پر گر کرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ مکالمی انداز میں اٹھی۔ کلاس میں پانی انڈیل کر علی کی طرف بڑھایا۔ کلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے علی کی نظریں بے اختیار ہی اس کی کلائی میں پڑے بریسلٹ کو چھو گئیں۔

رومی کا ہاتھ لرزا تھا اور اگلے ہی پل گلاس زمین بوس ہو گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اوپر چلی گی۔ علی حیرت کا بت بنے وہیں بیٹھا رہ گیا۔

”اگر صبا کو پتہ چل گیا کہ ہمایوں مجھ میں انوالو ہے تو؟“ کیا میں اس کی شکایتی نظریں برداشت کر سکوں گی؟ کیا اسے دکھ دے کر میں خوش رہ سکوں گی؟ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو ہمایوں کو صبا کے حوالے سے ہی سوچا تھا۔ وہ سب ڈر کر رہے تھے جب کہ وہ پچھلے چند روز منٹوں سے بس پلیٹ میں ڈالے چاولوں میں چپے گھما رہی تھی۔

علی مسلسل اس کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ وہ

اپنے خیالوں میں اتنی محنت کی علی کی خود پہ گزری نظریں بھی نہ محسوس کر سکی۔

”اور اگر ہمایوں نے بڑوں تک یہ بات پہنچا دی تو؟ اگر علی کو علم ہو گیا تو؟“ کتنے ہی بھیاٹک قسم کے ”اگر“ منہ کھولے کھڑے تھے وہ اپنے خیالوں کی پورش سے گھبرا گئی تو کرسی دھیل کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا؟ کھانا تو کھا لو۔“ اسے کھڑا ہوتا دیکھ کر امی جان نے کہا۔

”میں کھا چکی..... بس..... پلیٹ میں چاول جوں کے توں موجود تھے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی علی کی نظروں نے آخر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر ساتھ بیٹھے ہمایوں کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ رہی تھی علی کا ذہن نئے سرے سے الجھنے لگا۔

سندس آپنی کے بھائی کا پریوزل آیا تھا صبا کے لئے۔ ان کے والدین کو تو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن بڑی امی نے بعد میں سندس آپنی کو بتا دیا تھا کہ صبا کی نسبت بچپن سے ہمایوں کے ساتھ طے ہے۔ تیور کو پتہ چلا تو وہ سراپا احتجاج بن گیا۔

”یہ تم نے کیا کیا صبا؟“ اس نے نعت کدہ کا نمبر ڈال کیا۔ اس کی قسمت کو نون صبا نے ہی ریسو کیا۔

”تقدیر اپنا فیصلہ کبھی بھی کسی سے پوچھ کر نہیں کرتی تیور صاحب!“ اس کا اپنا دل ڈوب رہا تھا۔

”لیکن ایسا میرے ساتھ ہی کیوں؟ میرے جذبے تو پائیزہ تھے میں نے تو بڑے سیدھے طریقے سے ہمیں اپنانا چاہا تھا۔ پھر یہ ظلم میرے ساتھ کیوں کیا گیا؟“ اس کے درد کی آج صبا کو اپنے دل تک آئی محسوس ہوئی۔

”چند ایک ملاقاتوں کو آپ محبت کا نام نہیں

دے سکتے۔ آپ کو صرف فی الحال ایسا محسوس ہو رہا ہے۔“ اس سے زیادہ وہ خود کو سلی دے رہی تھی۔

”محبت تو محبت ہوتی ہے صبا! خواہ ایک لمحہ پر محیط ہو یا صدیوں پر لیکن میں اتنی جلدی مار ماننے والوں میں سے نہیں۔ تم میرا ساتھ دو گی ناں صبا!“ کیا تھا اس کے لہجے میں ڈر، آس، امید یا خواہش؟ مزید برداشت کا اس میں حوصلہ ہی تھا نہ۔ ریسور کریڈل پر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”صبا! کیا ہوا؟“ رومی لپک کر اس کے پاس آئی۔

”مجھے بچا لو رومی! پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے؟“ وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ چلو اپنے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے کمرے میں لے گئی۔ دروازہ لاک کر کے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا رومی! اک طرف عزت ہے تو دوسری طرف محبت ایک طرف جھکوں تو دوسرا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔“ پھر وہ اسے بتاتی چلی گئی۔ تیور اور اس کی ہونے والی چند ایک ملاقاتیں، اس کے پریوزل سے انکار پر تیور کا پر احتجاج فون، اس کا ہمایوں سے کترانا۔ رومی حیرت میں ڈوبی اسے سنتی رہی۔

”دیکھو اس طرح رو رو کر خود کو بلکان مت کرو۔ اللہ تعالیٰ جو بھی کریں گے یقیناً بہتر کریں گے۔“ شاید اس کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو بھی تسلی دی۔

دل تو اس کا بھی بلکان ہو رہا تھا اگر ہمایوں کی ایما پر اسے اس کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا تو وہ کیا کر لیتی؟ اس نے اپنے دل میں جھانکا کیا

وہ علی کے بغیر رہے گی؟ انہوں نے آپس میں کبھی عہد و پیمان نہیں کیے تھے تو کیا وہ ایک دوسرے کے احساسات کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔

ہمایوں واپس چلا گیا تھا لیکن جاتے ہوئے اس کی نیندیں اڑا گیا تھا۔

”میں فی الحال جا رہا ہوں لیکن جلد ہی تمہیں لینے دوبارہ آؤں گا۔ تمہارے بغیر میرا ہر پل بے سکونی میں گزرتا ہے۔ جی تو چاہ رہا ہے کہ میں ساتھ ہی لے جاؤں لیکن مجبوری ہے۔ اوکے۔ اپنا خیال رکھنا میری خاطر۔“ اس کا گال چھپچھپاتے ہوئے وہ باہر نکل گیا جب کہ رومی بے جان سی ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ نجانے اب کون سی قیامت آنے والی تھی۔

ہمایوں کو گئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ ایک رات کو تاپا ابا نے سب کو شنگ روم میں بلوایا تھا۔ سب کے دل ہی الگ الگ خوف لئے دھڑک رہے تھے کسی انہونی کا احساس خطرے کی طرح سر پر منڈلا رہا تھا۔

”تم سب لوگ ماشاء اللہ اب بڑے ہو چکے ہو اور شادی کے قابل ہو۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ باہر ادھر ادھر جھانکنے کی بجائے گھر کی بات گھر میں رہ جائے۔“ تاپا ابا نے بات کا آغاز کیا۔ ان سب کے دلوں کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو گئی تھیں۔ نجانے تقدیر کس رخ سے اپنا وار کرنے جا رہی تھی۔

”تمہاری خدیجہ پھپھو کا بھی فون آیا تھا۔ وہ رومیہ کو اپنی بہو بنانے کی خواہشمند ہیں۔“ رومی اور علی کے دل میں بیک وقت کسی نے خبر اتارا تھا۔

”لیکن علی کی بابت آپ مجھ سے بھی وعدہ کر چکے تھے بھائی جان!“ امی جان کی آواز رومی کو کسی گھائی سے آئی محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے محسنہ! ہم وعدہ

خلافوں میں سے نہیں۔ مجھے رومیہ اور نور العین میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ رومیہ کے لئے اگر خدیجہ کی خواہش ہے تو ہم نور العین کو اپنی بیٹی بنالیں گے۔“ یہ دوسرا ہم تھا جو ان سب کے سروں پر بلاسٹ ہوا تھا۔ یعنی اور زین بری طرح تڑپ کر رہ گئے تھے۔ چچی جان نے شاکی نظروں سے تاپا ابا کو دیکھا۔ کیونکہ زین جب بڑھنے کی خاطر نعت کدہ میں ٹھہرا تھا تو چچی جان نے کہا۔

”زین میرا بھانجا نہیں بیٹا ہے بھائی جان! شہزاد تو چھوٹا ہے لیکن زین کے لئے میں لڑکی نعت کدہ سے ہی لوں گی۔“

”جہیں تمہاری درخواست بھی یاد ہے نگہت! اگر زین العابدین کو تم نے بیٹا کہا ہے تو وہ ہمارا بھی بیٹا ہے اور تم ہمارے لئے خدیجہ کی ہی طرح ہو لہذا آج سے تم صیاحت کو اپنی بیٹی سمجھو۔“ یہ تیسری قیامت صغریٰ تھی۔

”سارے افراد اور رشتے گھر کے ہی ہیں لہذا منگنی وغنی جیسا کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔ ہم فول کے بچے لوگ ہیں اپنی باتوں سے پھرنے والے نہیں۔ البتہ شادیوں پر جیسے مرضی اپنے ارمان پورے کر لیتا۔ اس بقرعید یہ تمہاری پھپھو بھی آ جائیں گی۔ لہذا نکاح بقرعید کے مبارک دن ہوگا اور رخصتی دو دن بعد انشاء اللہ!“ تاپا ابا اپنی بات ختم کر چکے تھے اور ان کے ارمان رہ کون سے گئے تھے جو وہ پورے کرتے۔ بمشکل اپنے مردہ وجود کو گھسیٹتے وہ اپنے اپنے کمروں تک پہنچے تھے۔

”رومی! میری شرٹ پر لیس کر دو۔“ میڑھیاں اترتے ہوئے علی نے بہ نعلت کہا۔

شرٹ پر لیس کر دو نور! وہ اٹھنے ہی والی تھی جب وہ اسے ٹوک کر صبا کی طرف متوجہ ہوا اور شاید پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ رومی کی موجودگی میں علی کا کام

کوئی اور کرے اور شاید کسی کو محسوس نہ ہوا لیکن رومی کو لگا تھا جیسے اس کے دل میں برچھی اتر گئی ہو۔

”زین! آج جاتے ہوئے یعنی کو بھی چھوڑ آنا اس کا پریکٹیکل ہے اور تم نے بھی آج ڈرائیو ہی جانا ہے۔“ چچی جان نے زین سے کہا تو وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ یہ لوگ کیوں ان سب کا امتحان لے رہے تھے۔

وہ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے تھے۔ نئے طے ہونے والے رشتوں کو کوئی بھی دل سے قبول نہ کر پایا تھا۔ بایں تو اپنے بچوں کے دل کا حال چاہتی تھیں لیکن تاپا ابا جو اس گھر کے سربراہ تھے کوئی بھی ان کے آگے بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یا شاید ان کا مان نہیں توڑنا چاہتے تھے۔

دن نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہے تھے یا شاید انہیں ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ گھر میں شادیوں کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن اگر محوشی اور مسرت تو مفقود تھی۔ وہ سب بھی تباہی میں ساتھ دے رہے تھے لیکن مارے باندھے۔ یوں جسے زبردستی باندھ کر بیٹھائے گئے ہوں۔ ان کے شوخیاں اور شرارتیں جو ہمیشہ عروج پر رہتی تھیں۔ اپنی موت آپ ہی مر گئی تھیں۔ لڑکے تو گھر پہ نکلے ہی کم تھے اور لڑکیاں تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی قسبی رہتی تھیں۔ بس کھانا پکایا، کھایا، صفائی کی اور دوبارہ اپنے اپنے کمروں میں بند۔ بڑی امی چلائی رہیں۔

”اے لڑکیو! اپنے پسند کے کپڑے ہی خرید لو، شادی پہ تو لڑکیوں کی چیزیں ہی ختم نہیں ہوتیں اور تم تو ہر وقت پینز اٹھی رہتی ہو۔“

”آپ اپنی پسند سے لے لیں بڑی امی!“ ان سب کی بیزاریت اپنے عروج پہ ہوئی۔ جب دل ہی ہر قسم کے جذبات سے عاری ہو تو یہ مادی چیزیں کی کو کیا خوش پہنچا سکتی ہیں۔

بڑی امی کے دل کو ہول اٹھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی ان کی۔ ان دونوں کے اربابان نہ پورے کر سکیں وہ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اس گھر میں تو ہر شخص خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ کسی انہونی کا منتظر۔

”ارے بھائی! گھر میں کوئی نہیں رہتا آج کل۔ بڑے دنوں سے محسوس کر رہا ہوں ہر طرف ایک جامد، سناٹا سا لگتا ہے۔“ تاپا ابا تھوڑی دیر پہلے ہی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

”چلیں شکر ہے آپ کو محسوس تو ہوا۔“ بڑی امی کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”کیا مطلب؟“ ان کے طنز بھرے لہجے پر وہ چونک گئے۔

”اب بھی مطلب میں سمجھاؤں آپ کو؟“ بڑی امی نے شاکی نظروں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو حسنہ بیگم!“ وہ الجھن میں پڑ گئے۔

”مجھے بتائیں آپ کو اپنی اولاد سے کبھی کوئی شکایت ہوئی؟“ حسنہ بیگم نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ان کا سر بے اختیار نفی میں مل گیا۔ ان کی اولاد واقعی فرمانبردار تھی۔

”تو پھر آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟“ وہ اٹھ کر ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

”آپ نے اپنے بچوں کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ ان کی زبانیں بے شک خاموش ہیں لیکن ان کی آنکھیں بولتی ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ ایسے سعادت مند ہیں کہ خود ساری عمر سزا کاٹ لیں گے۔ لیکن آپ کا مان نہیں توڑیں گے۔ آپ کو ایک دفعہ بھی اپنے فیصلے پر افسوس نہیں ہوا۔“ بڑی امی کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ان کا دل پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ تاپا ابا کے ذہن میں

دھماکے سے ہونے لگے۔

”کیا ان کا فیصلہ غلط تھا؟ انہوں نے تو بڑی تمکنت کے ساتھ سب کے فیصلے کیے تھے اور اپنی اس کارکردگی پر وہ نہایت شانت بھی ہو گئے اور یہ ان کا حد سے بڑھا ہوا اعتماد ہی تھا کہ انہوں نے اپنی اولاد کے چہروں کی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی۔“

پھر آنے والے دنوں میں سب کچھ خود بخود ہی ان پر عیاں ہوتا چلا گیا۔ ان سب کے بیزاریت، اکتاہٹ، زبردستی کی مسکراہٹ یوں جیسے ادھار مانگی ہو۔ کسی ایک کے چہرے پر بھی خوشی کی ہلکی سی رقیق نہ تھی۔ ان کا دل ڈوبنے لگتا تو کیا مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

”ہم ٹول کے بکے لوگ ہیں اپنی باتوں سے پھرنے والے نہیں۔“ ان کی اپنی بات ہی ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

”تو کیا صرف اپنی ضد کے خاطر میں ان سب کی زندگی داؤ پر لگا سکتا ہوں؟“ وہ اپنا دل ٹپکتے۔ دل و دماغ میں ایک جنگ سی جاری تھی۔

صبح عید تھی ہر طرف خوشی اور چراغاں کا سماں تھا لیکن نعمت کدہ میں ہر طرف سناٹا راج کر رہا تھا۔ کل شام کو ان سب کے ”کاج“ کی بھی تقریب تھی۔ لیکن یہاں خوشی کی تھی؟

”رومی! پچھلی عید یہ کتنا مزہ آیا تھا ناں؟ ہم نے گائے کو مہندی بھی لگائی تھی اور خوبصورت رہن بھی باندھے تھے۔“ عینی کی آنکھوں میں پچھلی یادوں کے عکس بکھورے رہے تھے۔

”اور کل کے دن ہی میں پہلی مرتبہ تیمور سے ملی تھی۔“ صبا نے آہستگی سے کہا۔ رومی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو نجانے کہاں گم تھی۔

”تم پھر بھی اچھی رہ جاؤ گی رومی! نہ صرف اس گھر، اس شہر بلکہ اس ملک سے ہی چلی جاؤ گی۔ کم از کم اپنوں کے سامنے خود کو کمپوز نہ کرنا پڑے گا۔ ہمیں دیکھو ہم دوہرے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ محبت نہ ملنے کا غم ہی کم نہیں ہوتا اوپر سے سرگم کہ آپ کی وجہ سے دوسرے کی خوشیاں چھین گئیں۔“ صبا کے لہجے میں ٹوٹے کاغذ جیسی چھین تھی۔

”ضروری تو نہیں ہم جیسا سوچیں حقیقت بالکل ویسی ہی ہو۔ خواب اور حقیقت دو مختلف چیزیں ہیں۔“ رومی نے افسردگی سے کہا۔

”مجھے آج گائے کو سناٹا نہیں آخر کو صبح اس کی قربانی کرنی ہے کوئی مہندی وغیرہ لگاؤ اسے اور تم لوگ اتنی چپ چاپ کیوں ہو۔ تیاری شکاری کرو بھی۔ صبح عید ہے۔“ پچا جان نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تاپا ابا بھی ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔

ان تینوں کی متورم آنکھیں اور ویران سے چہرے ان سے ہرگز ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد تمام لڑکے بھی آگئے تھے۔ غالباً وہ سب عشاء کی نماز پڑھ کر آ رہے تھے تاپا ابا نے بغور ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔

خاموش، چپ چاپ، مضطرب، پریشان۔

”تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ آج کے خطبہ میں انہوں نے مولوی صاحب کو کہتے سنا تھا۔

”قیامت کے دن مجھ سے بھی ہر ایک کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ کل ان سب کے ہاتھ ہوں گے اور میرا گریبان۔ وہاں ایسی جامد خاموشی نہ ہوگی بلکہ ہر بات کا واضح اعلان ہوگا۔ وہاں تو ہاتھ، پاؤں بھی بولیں گے پھر زبان کیونکر

خاموش رہے گی؟“ انہوں نے خود کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔

کچھ دیر وہ ان کے درمیان بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چل دیئے۔

”یار! کیا وقت رک نہیں سکتا؟“ علی مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پچا جان بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ لڑکیاں تو انہیں دیکھتے ہی چلی گئی تھیں۔ گھر میں رونق اور چہل پہل نام کو نہیں تھی۔

”کاش کہ وقت رک سکتا تو میں اپنی ساری زندگی آج کی رات ہی جی لیتا۔“ علی بے چینی سے ادھر ادھر پہننے لگا۔

”بیٹھ جاؤ علی! کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہو؟“ زین نے اپنائیت سے کہا۔

کتنا شوق تھا زین کو ان سب کے ساتھ عید منانے کا۔ لیکن آج وہ ان کے ساتھ بھی تھا تو کس طرح؟ صبح اس کا نکاح تھا اس کے والدین نے صبح آنا تھا جب کہ زین یہیں رک گیا تھا۔

صفی اور شہزادان کی حالت دیکھ کر دکھ کے اٹھا ہسند میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ کاش کہ وہ ان کی خاطر کچھ کر سکتے۔ وہ تو صرف اللہ سے دعا ہی کر سکتے تھے اور یہ کام پچھلے کئی دنوں سے وہ بڑے زور و شور کے ساتھ کر رہے تھے۔ شاید ان کی کوئی دعا ہی رنگ لے آئی۔ لیکن ایسی کوئی صورت تو فی الحال نظر نہیں آرہی تھی۔ علی اور زین اگر اپنی قسمت سے شاکی ہے تو صفی اور شہزادان کے دکھ میں برابر کے شریک تھے۔

میرے دل میرے مسافر ہوا دھر سے حکم صادر کہ ہوں وطن بدر ہم تم دیں گلی صدا میں کریں رخ نگر نگر کا کر سرخ کوئی پائیں

کسی ہارنامہ برکا
ہراک انجی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرکوائے خاموشیاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ
کیا ہے؟
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

دکھ وہ سنائیں کس کو اپنا دلہنیں روتی ہوئیں
صحن میں بکھری ہوئی جن کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئیں
ہجر کا الاؤ ہو یا گھر کا ہو چوہا کوئی
دونوں طرف ہی آگ ہے اور لڑکیاں جلتی ہوئیں
مرد حضرات عید نماز پڑھنے گئے تھے جب
کہ خواتین گھر کا پھیلا واسیٹ رہی تھیں۔ صبح
سے رشتہ داروں کے فون آنا شروع ہو گئے تھے
کہ شام کو وہ سب تقریب میں پہنچ جائیں گے عید
کی وجہ سے کوئی بھی پہلے نہیں آ سکا تھا۔
پھپھو وغیرہ کی ٹیکس کنفرم نہیں ہوئی تھیں
لہذا طے یہ پایا تھا کہ رومی اور ہمالیوں کا نکاح فون
پر ہی ہو گا۔ پھپھو جلد از جلد پاکستان پہنچنے کی
کوشش میں تھی۔ ان کے پاکستان پہنچنے پر ہی
رخصتی کا پروگرام تھا۔

تایا ابا عید گاہ سے باہر نکلے۔ موسم نہایت
خوشگوار تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف
دیکھا۔
”اے میرے اللہ! مجھے درست فیصلہ

کرنے کی توفیق عطا فرما۔“ نظریں جھکائے
ہوئے انہوں نے ”آمین“ کہا تھا اور فیصلہ تو وہ
کر چکے تھے لہذا شانت سے ہو کر گھر کی طرف
چل پڑے۔

”پھر کیا خیال ہے تم لوگوں کا۔ قربانی خود
ہی کرو گے یا پھر کسی قصاب کو بلاؤں۔“
وہ سب عید نماز پڑھ کر گھر آ چکے تھے۔ تایا
ابانے انہوں سے پوچھا۔

”نہیں تایا ابا! قربانی ہم اپنے ہاتھوں سے
کریں گے کم از کم سال بعد ایک سیکی ہی سہی۔
شاید یہی کام آ جائے۔“ صفی کے چہرے پر
سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی البتہ آخری جملہ اس
نے دل میں ہی کہا تھا۔

”حسنہ نیگم! ذرا لڑکیوں کو تو بلاؤ عیدی تو
دے لوں انہیں۔“ تایا ابا کے کہنے پر وہ تینوں
ناچار لاؤنج میں آئی تھیں۔ بلکہ زبردستی کی
مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ”عید مبارک“ بھی کہا
تھا۔

تایا ابا کھڑے ہوئے باری باری ان تینوں
کو پیار دیا۔ تمام لڑکوں کو گلے لگایا۔ ان کی
آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”مجھے اپنی اولاد پر فخر ہے خدا ایسی
فرمانبردار اولاد سب کو دے۔ میں اپنے غلط فیصلے
سے بہت سی زندگیاں اجاڑنے جا رہا تھا لیکن خدا
کا شکر ہے جس نے مجھے بروقت صبح راستہ دکھا
دیا۔ خدا تم سب کو دائمی خوشیاں دے۔“ تایا ابا کی
باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں وہ سب
ہونفوں کی طرح آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے
انہیں دیکھ رہے تھے۔

بقبرہ عید کی شام ”نعمت کدہ“ میں اپنی تمار
خو بصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی تھی۔
رومی کے پہلو میں علی، زین کے پہلو میں

یعنی جب کہ صبا کا پہلو خالی تھا۔ اس لئے وہ بے
چینی سے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ رات تیزی
کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ ہر طرف رونق اور گہما
گہمی تھی۔ سب کے چہروں سے خوشی پھوٹی پڑ
رہی تھی۔

سندس آپی کے والدین انہیں عید ملنے آئے
تھے۔ تایا ابا نے ان سے صبا کے رشتے کی بات کی
وہ تو پہلے ہی دو دفعہ دست سوال پھیلا چکے تھے۔
نوراً خوشی سے راضی ہو گئی۔ لیکن تیمور کا پتہ نہیں
چل رہا تھا۔ وہ دوپہر سے گھر سے غائب تھا۔
موبائل بھی آف تھا۔ بڑی امی کا اصرار تھا کہ
تینوں نکاح ایک ساتھ کیئے جائیں اور تیمور کی وجہ
سے وہ رکے ہوئے تھے۔ وہ بے چارہ تو
صورتحال سے یکسر لاعلم بن جانے کہاں کی خاک
چھان رہا تھا۔

”کہاں مرے ہوئے ہو تم۔ دوپہر سے نمبر
پش کر کر کے میری انگلیاں کھس گئی ہیں۔“ بالآخر
سندس آپی کی کال مل گئی تھی۔ وہ بری طرح
گرہیں۔

”دراصل میں ایک.....“ سندس آپی نے
اس کی بات کاٹ دی۔

”جہاں کہیں بھی ہو پندرہ منٹ کے اندر
اند“ نعمت کدہ“ پہنچ جاؤ تمہاری وجہ سے پہلے ہی
بہت دیر ہو چکی ہے۔“ اس کی بات نے بغیر
انہوں نے فون بند کیا۔

تیمور ہکا بکا رہ گیا بہر حال پندرہ منٹ تک
وہ واقعی نعمت کدہ پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ
صورتحال سمجھتا۔ صفی بھناتا ہوا آیا تھا اور بکڑے کی
طرح اسے کھینٹتے ہوئے صبا کے برابر والی چیز پہ
بٹھا دیا۔

”چلیں مولوی صاحب شروع کریں۔“ چچا
جان نے کہا تو مولوی صاحب نے خاصی مشکوک
نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا۔ آف وہاٹ

سی شرٹ جو پہنتے وقت یقیناً وہاٹ تھی۔ بیلو
ٹراؤز، پاؤں میں عام سے سلیپر، بکھرے اٹکھے
بال وہ کہیں سے بھی دو لہانیں لگ رہا تھا۔

”نعمت تم یہ مہربان ہو گئی سے تیمور!“
سندس آپی نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر سرگوشی
کی۔ اس نے ایک نظر اپنے ساتھ سٹے سٹائے
وجود پہ ڈالی اور اس کا دل خوشی اور تشکر کے بے
تجاشا احساس سے لبریز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی
مبارک سلامت کا شور ان کے کانوں میں گونج رہا
تھا۔

تایا ابا کا ارادہ تو صرف نکاح کا تھا لیکن
تیمور کے گھر والے رخصتی پہ زور دے رہے تھے۔
ان کے اٹکھے اصرار پر وہ انکار نہ کر سکے تو پھر علی
اور زین کیوں پیچھے رہتے۔

رات کالی ہو چکی تھی لہذا صبا کو سندس آپی
کے گھر ہی لے جایا گیا تھا۔

”آہم۔“ تیمور اس کے بے حد قریب بیٹھ
چکا تھا صاف تھوڑا پیچھے سرک گئی وہ نہ صرف مزید
قریب ہو گیا بلکہ اپنا دایاں بازو بھی اس کے گرد
پھیلا دیا۔

”پیچھے نہیں۔“ صبا نے اسے دھکیلا۔

”اپنی گوشت کی شمل آ رہی ہے کیا سارا
دن بکروں کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہے
ہیں۔“ وہ اپنا دلوہنا یکسر فراموش کر چکی تھی۔

”بس یار! تمہیں پتہ تو ہے آج کے دن
قصائیوں کی کتنی قلت ہے۔“ اس نے سر کھمایا۔

”تو کیا سارا دن قصاب کا رول پلے کرتے
رہے ہیں؟“ صبا نے آنکھیں پھاڑیں۔ تیمور کا
قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”آج کے دن تو رحم کرو۔ آتے ہی لڑاکا
بیویوں کی طرح شروع ہو گئی ہو۔“ تیمور کا لہجہ آج
دینے لگا تھا۔ صبا کی پللیں بے ساختہ جھک گئیں۔

زین کمرے میں داخل ہوا تو یعنی کو زارو
قطار روتے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

”کیا ہوا یعنی؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ لپک کر
اس کے پاس آیا۔

”چلو کے رخصتی کر دی میری، میں نے کہا
بھی تھا ابھی نہیں، نہ مجھے کچھ پکانا آتا ہے اور
تمہیں تو پتہ ہے ناں زین! مجھے کام سے سخت
نفرت ہے۔“ بھل بھل بھتے آنسوؤں کے ساتھ
وہ اپنی ازلی سادگی سے گویا تھی۔ زین بے ساختہ
مسکرا دیا۔

”کام سے بے شک نفرت کرو لیکن مجھ
سے تو محبت کرو گی ناں۔“ ایک ہاتھ سے اس کے
آنسو پونچھتے ہوئے اس نے گھمبیر لہجے میں کہا تو
یعنی کو ایک دم اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔ اس
نے گڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ دل الگ زور زور سے
دھڑکنے لگا تھا۔

”تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔“
اس کی طرف جھکا وہ پوچھ رہا تھا۔ یعنی کے چہرے
پہ حیا اور مسکراہٹ بکھر گئی اور زین کو اپنے تمام
سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔

”تم پہلے میری منہ دکھائی نکالو باقی باتیں
بعد میں بگھارنا۔“ ادھر رومی اور علی کا آج بھی اپنا
ہی جھگڑا تھا۔

”یقین کر دو رومی! اس وقت میرے پاس
ایک روپیہ تک نہیں ہے؟“ علی کے لہجے میں
شرارت تھی۔

”شادی کروانے کا پتہ تھا رونمائی کے لئے
گفٹ خریدنے کا پتہ نہیں تھا۔“ اس نے چلتے
عورتوں کی طرح ہاتھ نیچا کر کہا۔

”اوہ..... پس۔“ وہ جوش سے اٹھا اور اسٹڈی
روم میں گھس گیا تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو اس کے
ہاتھ میں ڈھیر ساری کاجی کی چوڑیاں تھیں۔

”تمہیں یاد ہے چھپلی عید پہ تم نے مجھے

چوڑیاں لانے کا کہا تھا۔ چوڑیاں تو میں اسی دن
لے آیا تھا۔ لیکن تمہیں چڑانے کے لئے میں
تمہیں دی نہیں تھیں۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ایسے
کڑے وقت میں یہ میرے کام آئیں گیں۔“
چوڑیاں اس کی کلائی میں پہناتے ہوئے اسے بتا
رہا تھا۔

”علی! اگر تم چوڑیاں خرید ہی لاہے تھے تو
مجھے دینے میں کیا قناعت تھی؟“ وہ کچھ حلقی سے
پوچھ رہی تھی۔

”اب بھی تو تمہیں ہی دے رہا ہوں ویسے
اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تمہاری شادی مجھ سے
ہونی ہے تو میں بڑا زبردست سا گفٹ خریدتا۔“
وہ چوڑیاں اسے پہنا چکا تھا۔

”قدر خلوص کی ہوتی ہے قیمت کی نہیں۔“ اپنی
کلائی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔
”اور میری طرف سے اس خلوص میں ہمیشہ

اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔“ اس نے گویا اسے یقین
دلایا تھا۔

”ویسے میڈم! آپ کی رونمائی تو آپ کو مل
گئی ہے اگر اجازت ہو تو تھوڑا رومانس بگھار
لوں۔“ دنیا بھر کی شرارتیں اس کے لہجے کا حصہ
بنی ہوئی تھیں۔

”دیکھو علی! تم کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں
کرو گے۔“ وہ اس کی کلائی تمام چمکا تھا۔ رومی
کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

”اوکے پر اس الٹی کوئی حرکت نہیں کروں
کا ساری سیدھی حرکتیں کروں گا۔“ اس کا انداز ہنوز
برقرار تھا۔

”تو پھر پہلے بندروں کی طرح گھورتا بند
کرو۔“ وہ فوراً بولی تو بے اختیار علی کا قبضہ گونج
اٹھا جس میں رومی کی شریلی مسکان بھی شامل
تھی۔

☆☆☆